زیرِ مطالعہ کتاب نقاد و شاعر شبیر ناقِدؔ کے ایما پر شائع کی گئی ہے اور اس کے جملہ حقوق اور متن کی تمام تر ذمہ داری انہی کو مستحسن ہے۔ پبلشر یا پرنٹر قطعاً ذمہ دار نہیں۔ ادارہ اردو سخن ڈاٹ کام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قارئین تک بہترین اور اغلاط سے پاک ادبی مواد پہنچایا جائے اور اس ضمن میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لایا جاتا ہے تاہم غلطی کی نشاندہی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی درستی کی جائے۔ (ادارہ)

(تحقیقی وتنقیدی تجزیاتی شذرات)

# ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن کا اختصاصی مطالعہ

شبیر ناقدؔ

اردوسخن
آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون:0302-7844094
www.urdusukhan.com

# ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے کلام کا اختصاصی مطالعہ

شبیر ناقِدؔ
معرفت پروفیسر ظہور احمد فاتح، نزد تعمیرِ نو اکیڈمی
کالج روڈ، تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازیخان (پنجاب۔ پاکستان)
رابطہ فون: ۰۳۴۲-۵۲۳۷۶۳۶ ۰۳۰۳-۹۲۹۷۱۳۱ ۰۳۳۳-۵۰۶۶۹۶۷

اُردو سخن

استحقاق: تمام تصرفات ''شبیر ناقِدؔ'' کی تحویل میں ہیں
ناشر: اردو سخن ڈاٹ کام، پاکستان
نمودِ اول: ۲۰۲۴ء

کمپوزنگ: محمد شہریار ناصر
سرورق: ناصر ملک
طباعت: شیر ربانی پریس، ملتان
قیمت: ۱۶۰۰ روپے (۵۰ یورو، ۵۵ ڈالر)

اردو سخن
آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094
www.urdusukhan.com

# انتساب

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی تخلیقی قرینہ کاریوں
کے نام!

# فہرست

1۔ باب اول

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا سخن مسئلہء جبر وقدر کے تناظر میں 7

2۔ باب دوم

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کلام 30

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے پس منظر میں

3۔ باب سوم

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں زمانہ شناسی 48

4۔ باب چہارم

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا تصورِ حسنِ آرزو 104

5۔ باب پنجم

اختصاصی مطالعے کا اجمالی جائزہ 163

----

# باب اول

## ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا سخن مسئلہء جبر وقدر کے تناظر میں

یہ ایک دیرینہ بحث ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے یا مختیارِ کل......اس حوالے سے ایک بہت عمدہ مثال حضرت علیؑ سے دریافت کیا ہوا ایک مسئلہ ہے جب ان سے اس سلسلے میں کسی نے استفسار کیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ اپنا ایک پاؤں اٹھاؤ، تو اس نے فوراً اٹھایا۔ فرمایا دوسرا پاؤں اٹھاؤ۔ اس نے کہا تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تو آپؑ نے فرمایا تھا کہ پہلا قدم اٹھانا تمہارا اختیار ہے اور دوسرا قدم نہ اٹھا سکنا یہ تمہارا جبر ہے۔ اس سے آپ یہ مراد بھی لے سکتے ہیں کہ پہلا قدم اٹھانا قبیلِ ممکنات سے تعلق رکھتا ہے جبکہ دوسرا قدم نہ اٹھایا جا سکنا قبیلِ ناممکنات سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ مذکورِ اول فطری معاملہ ہے جبکہ مذکورِ ثانی غیر فطری ہے۔

اس دنیا میں بھی جو سلسلہ ہائے کار پردازی پائے جاتے ہیں، ان میں بھی جبر و قدر کے شواہد موجود ہیں۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہوتا ہے اور دوائی سے اس کی مسیحائی ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرا شخص شفایاب ہونے کی بجائے ......

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کے زمرے میں آ جاتا ہے۔

یہ موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ شعروادب کے بہت سے مسائل اس کی ذیل میں آ جاتے ہیں۔ خصوصاً قسمت، نصیب، تقدیر، لوحِ محفوظ یا نوشتہء تقدیر کے معاملات اس کی ذیل میں آتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنا اہم

موضوعِ سخن ہونے کے باوجود بھی ناقدین و محققین حضرات نے ہمیشہ اس سے گریز کا طرزِ عمل ظاہر کیا ہے۔ اسے ہم ان کی ذہنی نارسائی یا ناپختہ کاری کا مظہر قرار دے سکتے ہیں۔ عموماً مطالعاتی طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ کسی شاعر کے حوالے سے اس نکتہ کو نہیں چھیڑا گیا جبکہ سب اہلِ قلم کے ہاں اس کی کچھ نہ کچھ جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔

ابو البیان ظہور احمد فاتح جو دائیں بازو کے سخنور ہیں، ان کے ہاں اس کے مظاہر بکثرت دیکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے حوالے سے اس موضوع کا انتخاب بالیدہ فکری یا جدت طرازی کا مظہر ہو سکتا ہے۔ چونکہ تصنیف ہذا ابو البیان ظہور احمد فاتح کے کلام کا اختصاصی تجزیاتی مطالعہ ہے، اس لیے ہم نے بھی اس موضوع کو شامل کیا ہے۔ ہماری تو یہ کوشش رہے گی کہ ہم خصوصی موضوعات کے پس منظر میں بات کریں۔ بسلسلہ ہذا ابو البیان ظہور احمد فاتح کا تازہ ترین شعری مجموعہ ''صبحِ بہاراں'' مطبوعہ 2022ء ہمارے زیرِ نظر ہے جو ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے جس میں غزلیات و منظومات شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ گیت بھی کتابِ مذکور کا حصہ ہیں۔ ہمارا یہ طریقہء کار ہو گا کہ موضوع مذکور کی نسبت سے منتخب شعری استشہادات برائے استخراجات موقع بہ موقع شاملِ شذرہ کریں گے۔

کتاب کی دوسری کاوش بعنوان ''دعا'' جو غزل کی ہیئت میں کہی گئی ہے اس میں تین اشعار بطور استشہاد مرقوم ہیں۔

تا عمر میں اطاعتِ خیر الوریٰ کروں
اس دل کو ان کا عشق و ارادت نصیب ہو
اب تک نہ اس مریض کی پرسش کو آ سکے
سکرات میں تو اُن کی عیادت نصیب ہو
جذبہ ہو جس کے قلب میں احیائے دین کا
ملت کو ایک ایسی قیادت نصیب ہو

(ص:13)

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ عموماً شعراء کے ہاں جبری مسائل زیادہ پائے جاتے ہیں جس کے باعث یاسیت اور بے عملی کی کیفیت فزوں تر ہو جاتی ہے لیکن یہ ایک خوشگوار حقیقت ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں قدری عوامل کی بھی کوئی کمی نہیں ہے جس سے مقصدِ حیات کا ادراک پیدا ہوتا ہے۔ ان کے فکری کینوس میں دعائیہ اشعار اور حسنِ آرزو کے جذبات کا بھی وفور ہے۔ جس سے رجائی پہلو مضبوط ہوتا ہے اور قارئین کو طربیہ اور مثبت امور سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ شعرِ اول میں حضور پرنور کی تاعمر اطاعت اور حسنِ ارادت کی تمنا کا اظہار ہے کہ ایک بندۂ مومن کی دینوی اور اُخروی فلاح ونجات کی کلید ہے۔ شعر دوم میں جبری احساس کو حسنِ آرزو نے دلکش بنا دیا ہے کہ میرے محبوب جو میری عیادت کے لیے یہاں تشریف نہیں لا سکتے، کاش آخرت کے سفر میں ان کی رفاقت بھی حاصل رہے۔ تیسرا شعر برنگِ دعا شانِ قدر کا حامل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کو اچھے رہنماؤں کی قلت کا سامنا رہا ہے۔ قحط الرجال کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ سخن وراس آرزو کا اظہار کر رہا ہے اور یہ دعا مانگ رہا ہے کہ خدا کرے امتِ مسلمہ کو ایسے قائدین میسر آ جائیں جن کے دلوں میں دین کو پھر سے زندہ کر دینے کی تڑپ موجود ہو۔ مذکورہ استشہادات سے یہ عندیہ بھی ضرور ملتا ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں جبر و قدر میں ایک معقول توازن کارفرما ہے۔ ان کے قارئین کو ان کی نگارشات سے نظم وضبط اور مقصدیت کے گہرے تاثرات ملتے ہیں۔ چنانچہ علی ہذا القیاس وہ کہیں لایعنیت کا شکار ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

آیئے، اب مجموعہء کام ''صبحِ بہاراں'' میں شامل ایک اور غزل کے دو اشعار جو جبر کی کیفیت کے حامل ہیں، دیکھتے ہیں۔

ہم یہاں چند گھڑیوں کے مہمان ہیں کاش تم جانتے

اپنے فردا کی نسبت پریشان ہیں کاش تم جانتے
ہے تمھیں یہ گلہ شہر والوں سے رغبت نہیں ہے ہمیں
اپنی قسمت میں لکھے بیابان ہیں کاش تم جانتے

ابو البیان ظہور احمد فاتح کے فحوائے شعر میں جبری عناصر بھی مقصدیت کی طرف راغب کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ ان کا مقصودِ خاص یاسیت اور قنوطیت کا درس دینا ہرگز نہیں ہے۔غزل کی ردیف کا مجموعی تاثر'' کاش تم جانتے'' قارئین کو خبردار کرنا اور دعوتِ مطالعہ دینا ہے۔ پہلے شعر میں بڑے رقت آمیز انداز میں دنیا کی ناپائیداری کا حوالہ پایا جاتا ہے جو انسان کی سب سے بڑی مجبوری ہے۔ بقول استاد ذوق:

لائی حیات آئے قضا لے چلی ، چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

لیکن ابو البیان ظہور احمد فاتح عمر کی ناپائیداری کو سعیِ پیہم سے جوڑتے نظر آتے ہیں۔ تھوڑے سے وقت کے لیے ہم آئے ہیں اور اس فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ ہمارا مستقبل روشن ہو جائے۔ وہ فردا کہ دنیا میں آنے والا آئندہ وقت کو یا حیات بعد از وفات ہو کہ کامیابی کی کوشش بندۂ مومن کا منتہائے مقصود ہے۔شعر ثانی میں کہا گیا ہے کہ میرے دوست کو یہ شکوہ ہے کہ مجھے شہروں سے کوئی رغبت نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ میرے مقدر میں بیابان ہی لکھ دیے گئے ہیں۔ لہٰذا فطری طور پر مجھے ویرانوں سے ہی دلچسپی ہونی چاہیے۔ شعر ہذا میں شاعر نے بڑے لطیف انداز میں قسمت کی کارستانی کا حوالہ دیا ہے اور خود کو ملامت سے بری الذمہ ٹھہرانے کی عمدہ کوشش کی ہے جیسے خواجہ میر درد نے فرمایا تھا:

شفا اپنی تقدیر میں ہی نہ تھی
کہ مقدور بھر تو دوا کر چلے

غزل ہذا بحر متدارک مسدس مضاعف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان فاعلن

فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہیں۔

ایک اور غزل کا مطلع ملاحظہ ہو جو خود میں متعدد فکری امکانات لیے ہوئے ہے۔

خواہش تو تھی بہت ہمیں عمرِ دراز کی
کی مختصر ، ہو خیر مرے چارہ ساز کی

(ص:18)

اس میں بھی مسئلہ جبر و قدر جا گزیں ہے یعنی ہم تو چاہتے تھے کہ لمبی زندگی جئیں مگر ہمارے چارہ گر کی خیر ہو جس نے اسے مختصر کر ڈالا۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ چارہ گر جو باعثِ تخفیفِ حیات بن رہا ہے، اس کے لیے دعائے خیر کی جارہی ہے۔

دوا اور اشعار بحوالہء جبر آئندہ غزل میں بھی موجود ہیں۔

ہوتا تو کیسے ہوتا ہمارا مرض درست
دشمن ہماری جان کے اپنے طبیب تھے
راتوں کی نیند اڑ گئی یہ سوچ سوچ کر
تجھ کو جو پا نہیں سکے ہم بدنصیب تھے

(ص:20)

ان دونوں اشعار میں جبر کے جو حوالے پائے جاتے ہیں، وہ ایک طرح کا احساسِ زیاں ہے یا یوں سمجھیں کہ رنجِ رائیگانی ہے جس میں نہ قسمت کا گلہ ہے اور نہ کربِ یاس پایا جاتا ہے۔ جس کا مصداق یہ شعر ہے

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو میں نہ ملا اور کسی کو تو نہ ملا

اس کے بعد والی غزل کے مطلع میں یہ کیفیت دیکھی جاسکتی ہے۔

جانِ بہار کیسے مزاجِ شریف ہیں

ہم تو ترے بغیر نزار و نحیف ہیں

(ص:21)

مزاج پرسی کا یہ انداز بڑا عجیب ہے جس میں اشارتاً یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ تمہارے بغیر ہمارا حال بھی پتلا ہے۔ دراصل اس شعر میں ایک عمیق نفسیاتی وحسیاتی تاثر بھی کارفرما ہے۔ جس کے پہلو بہ پہلو رومانویت بھی شاملِ حال ہے جس کا مجازی پہلو غالب ہے۔ آمدہ غزل کا ایک شعر جو خود مسئلہ قدر کا تاثر لیے ہوئے ہے، قابلِ ذکر ہے۔

تجھ کو حاصل اگر شہادت ہو
یہ بھی معیارِ سرفرازی ہے

(ص:23)

مراد یہ ہے کہ شہادت بظاہر جان کا ضائع ہونا ہے لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ اگر شہادت میسر آجائے تو اس میں سرفرازی کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ دراصل شہید ہونا انسان کے اپنے بس میں نہیں بلکہ یہ تو خوبیٔ تقدیر پر منحصر ہے۔

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

آیئے اس سے آگے والی غزل دیکھتے ہیں جس کے اکثر اشعار کیفیتِ جبر سے متصف ہیں۔

ادھر بسمل پریشاں ہے
ادھر قاتل پریشاں ہے
وہاں طوفاں ہے سرگرداں
یہاں ساحل پریشاں ہے
کسی کی جاں پراگندہ

کسی کا دل پریشاں ہے
کہیں رہ رو ہے آوارہ
کہیں منزل پریشاں ہے
ہے میرا خرچ بے صرفہ
ترا حاصل پریشاں ہے
نصیبِ حق ہے جمعیت
مگر باطل پریشاں ہے
کبھی مضطر ہے تنہائی
کبھی محفل پریشاں ہے
ترا فاتحؔ کہ سونا تھا
مثالِ گل پریشاں ہے
(ص:25-26)

ایک شعر کو چھوڑ کر باقی سب اشعار میں سلسلہء پریشانی کارفرما ہے لہٰذا غزل کی ردیف ''پریشاں ہے'' پورے طور پر جبر کی طرف مشیر ہے۔ جو خود میں ایک حزنیہ تاثر لیے ہوئے ہے۔ جو جبر کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ جہاں تک حق و باطل کے جداگانہ کوائف کا تذکرہ ہے، وہ بھی اصولِ قدرت کی جکڑ بندیوں کا نتیجہ ہے۔ البتہ مقطع میں سونے کا مٹی کی طرح بکھر جانا ایک دنیاوی نقصان کا بھرپور حوالہ ہے جو شاعرانہ تعلّی کا حامل ہے۔ غزل ہذا بحر ہزج کے مربع وزن میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

جبری حوالے سے ایک اور غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

ان سے کہنا کہ میں سخت بیمار ہوں
ہجر کے عارضے میں گرفتار ہوں

(ص:35)

گویا ایک پیغام کے ذریعے عجز و مجبوری کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اگر چہ رنجِ ہجر لاحق ہے۔ اس نے بیمار بنا کر رکھ دیا ہے جس کا علاج صرف اور صرف محبوب ہی کر سکتا ہے جو فروکش نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ شعر رومانوی جبر کا نمائندہ ہے۔ شعر ہذا بحر متدارک مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہے۔

اس کے بعد ایک اور غزل کے ایک شعر میں بھی اسی نوعیت کا اظہار موجود ہے۔

جاگنا ہے مجھے صبح کے وقت بھی
رات کے دو بجے بھی میں بیدار ہوں

(ص:36)

اس شعر کو آپ جبرِ ذمہ داری پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔ یعنی میرا وظیفہ جاگنا ہے، چاہے وہ صبح کا وقت ہو یا رات کے دو بجے ہوں۔ اس شعر کا اشارہ فکری ریاضت ور قلمکارانہ مشقت کی طرف بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی میں فطری طور پر ایسے کرنے پر مجبور ہوں۔ شعرِ مذکور ماقبل بحر و وزن میں کہا گیا ہے۔

اسی طرح کا ایک شعر آمدہ غزل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

بنتا ہے نمک جاتا ہے جو کانِ نمک میں
گمراہ جو ہیں وہ تمھیں گمراہ کریں گے

(ص:38)

یہ شعر ماحولیاتی اور معاشرتی جبر کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ فارسی کا مشہور قول ہے:

؎ آں چہ در کانِ نمک رفت نمک شد

محبت کے گہرے اثرات انسان پر مرتب ہوتے ہیں۔ محبت آوارگان انسان کو آوارہ بنا ڈالتی ہے۔ فارسی کا یہ شعر اس کا مصداق ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبت طالع ترا طالع کند

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابو البیان ظہور احمد فاتح کا شعرِ مذکور خود میں تمثیلاتی فضا سموئے ہوئے ہے۔ جسے بیان کی قرینہ کاری کہا جا سکتا ہے۔ یہ شعر بحر رمل مسدس مقصور میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلان ہیں۔

اس سے آگے ایک اور غزل کا مطلع عالمِ جبر کا عکاس ہے۔

ہوئے ہیں عائد خراج کیسے؟
ادا کیے ہم نے باج کیسے؟

(ص:58)

گویا عام زندگی ہو یا معاشرتی حیات اس میں یہ جبر لاحق ہے کہ کوئی نہ کوئی باج، خراج یا ٹیکس لامحالہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ شعر ایک مربع وزن میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعلاتن مفاعلاتن ہیں۔ واضح رہے کہ یہ وزن بحر رجز یا بحر کامل سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

بعد ازاں ایک ایسی غزل دامنِ توجہ کھینچ رہی ہے جو تمام و کمال جبری عوامل کا مرقع ہے اور اس کا تبصرہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ دیدہ باید کہ وہ اس حوالے سے کیا رائے قائم کرتے ہیں۔

وہ جو خونِ دل سے لکھی گئی مِری زندگی ہے وہ داستاں
وہ جو روتے روتے پڑھی گئی مِری زندگی ہے وہ داستاں
کبھی میگزین میں چھپ گئی کبھی فیس بک میں رقم ہوئی
وہ جو دور دور چلی گئی مِری زندگی ہے وہ داستاں
وہ جو مالا مال الم سے ہے وہ جو دردناک ستم سے ہے
وہ جو آہیں بھر کے سنی گئی مِری زندگی ہے وہ داستاں

جو ہے آنسوؤں میں ڈھلی ہوئی، غم و رنج سے ہے بھری ہوئی
وہ جو سسکیوں میں کہی گئی مری زندگی ہے وہ داستاں
میں ہوں فاتحِ شبِ ابتلا مجھے بھانت بھانت کا دکھ ملا
جو لہو کلیجے کا پی گئی مری زندگی ہے وہ داستاں
(ص:67)

جبر کی نسبت سے ایک اور شعر اس سے آگے والی غزل میں بھی جا گزیں ہے۔

رواں دواں ہے سمندِ مستی برنگِ برق و نخیلِ ہستی
یہ گردشِ روز و شب ہے جاری کہاں تھمی ہے کہاں رکی ہے
(ص:68)

یہ شعر قدرتی جبر کے بیان سے تعلق رکھتا ہے کہ زندگی کا گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بلند قامت نخل پر بجلیاں گرتی ہیں گویا مصرع اولیٰ ایک استعاراتی فضا کا حامل ہے اور مصرع ثانی تشبیہاتی انداز خود میں سموئے ہوئے ہے۔ دونوں مصارع عالمِ جبر پر دال ہیں۔ یہ شعر مثمن وزن میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن ہیں۔

آمدہ غزل کا ایک شعر رومانوی و سیاسی جبر کا مرکب ہے۔

پلکوں سے ہی اُس قصر کی جاروب کشی کی
کب ہم نے نہیں خاکِ درِ شاہ اڑائی
(ص:70)

چنانچہ ہم نے جہاں طرزِ محبت کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی، وہاں سیاسی مجبوریوں کا بھی پورا پورا ساتھ نبھایا ہے۔

غزلِ مابعد میں دو اشعار موضوعِ جبر کے حامل ہیں۔

مضطرب میں کب نہیں تیرے بغیر
آہیں کب تیرے لئے بھرتا نہیں
پا نہیں سکتا حیاتِ جاوِداں
وہ جو فاتحؔ عشق میں مرتا نہیں

(ص:74)

دونوں اشعار جبرِ عشق کے مظاہر ہیں۔ یہ دونوں اشعار بحر رمل مسدس مقصور محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ فاعلان ہے۔

لیجئے اگلی غزل کا مطلع ہی بسلسلہء جبر اپنی طرف توجہ مبذول کرا رہا ہے۔

ہمیں رکھا گیا ہے قید اک زندانِ خواہش میں
کمی آتی نہیں پھر بھی ہمارے دل کی تابش میں

(ص:75)

جبر کا یہ پہلو جس کے پہلو بہ پہلو خود ستائی کی کیفیت پائی جاتی ہے، خواہش کو زندان کے استعارہ میں لا کر خود کو مجبور ظاہر کیا گیا ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اس جبر کے باوجود ہمارے جرمِ دل کی تابش میں ذرا بھی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ہنوز آب و تاب کا وہی عالم ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ شعر ہذا میں دلفریبی و دل نوازی کے مظاہر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ شعر ہذا بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

آگے چلیے تو غزل کا مقطع اسی کیفیت کا مظہر ہے۔

دل یہ کہتا ہے کہ فاتحؔ مَے ملے
اک پیالہ پاس جل کا بھی نہیں

(ص:78)

ہمارا عالمِ جبر یہ ہے کہ ایک پیالہ پانی بھی دستیاب نہیں بہ ایں بے سروسامانی حضرتِ دل ساغرِ مے کا آرزومند ہے جیسے غالب نے کہا تھا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بہ الفاظِ دیگر آرزو اور بے بضاعتی کے درمیان ایک شدید کشمکش جاری ہے۔ اگر آپ چاہیں تو شعر ہذا کے دونوں مصرعوں کو صنعتِ مبالغہ پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔ پہلے مصرع میں صنعتِ مبالغہ امکانی اور دوسرے مصرع میں صنعتِ مبالغہ یقینی کارفرما ہے۔ عموماً ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں مبالغہ کم پایا جاتا ہے لیکن جہاں جہاں اس کے مظاہر ملتے ہیں، وہ بیانیہ مقتضیات کے آئینے میں نادر اور حیران کن ہوتے ہیں۔ شعر ہذا بحر رمل مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

مثل مشہور ہے ''یک نہ شد دو شد'' بلکہ یہاں تو ''یک نہ شد سہ شد'' والا معاملہ محسوس ہو رہا ہے۔ آنے والی غزل تین ایسے اشعار کی حامل ہے جو جبری عناصر خود میں سموئے ہوئے ہے۔

بسر کی شبِ عاشقی سسکیوں میں
گزاری ہے تشنہ لبی سسکیوں میں
اداسی میں ہم نے گزارا ہے جیون
کبھی بھر کے آہیں، کبھی سسکیوں میں
ترے بعد اجڑا خمستان ساقی
کبھی مَے بھی پی ہے تو پی سسکیوں میں
(ص:79)

غزل کی ردیف ''سسکیوں میں'' فی نفسہٖ جبر کا بھرپور حوالہ ہے اور لطف کی بات یہ

ہے کہ اس میں لسانی وفکری دونوں پہلوؤں میں ایک خاص کیفیتِ جبر پائی جاتی ہے جو خود میں فزوں تر تاثرات رکھتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں شدید حزنیہ رنگ بھی پایا جاتا ہے جو جبر کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ رومانوی وخمریاتی پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اشعار بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان فعولن فعولن فعولن فعولن ہیں۔

بعدازاں ایک نظمِ معریٰ بعنوان ''موت'' تین مختلف کیفیات کی حامل ہے۔ اس کا ثلث اول جبریہ خیالات کا حامل ہے۔ ثلث دوم قدریہ امکانات خود میں سموئے ہوئے ہے جبکہ ثلث سوم ذہنی بیداری پر مشتمل ہے۔ یوں یہ نظم خود میں خاصے جبری پہلو رکھتی ہے۔ نظم ہذا بحر خفیف مسدس محذوف مخبون میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو۔

موت مذکور زیست سے پہلے
موت لازم ہے زندگی کے لئے
موت کا جام سب نے پینا ہے
ذائقہ اس کا سب نے چکھنا ہے
موت کڑوی ہے سخت کڑوی ہے
موت سے بچنا غیر ممکن ہے
موت ایسی اٹل حقیقت ہے
اس کے منکر نہیں ہیں کافر بھی
موت سے کب فرار ممکن ہے
برجِ سنگیں میں جا کے چھپ جاؤ
موت تم کو وہاں بھی پالے گی

رزق پورا نہ کھاؤ گے جب تک
موت تب تک تمھیں نہ آئے گی
موت کا ایک دن معین ہے
موت کو ٹالنا ہے ناممکن
اپنے مالک سے جس نے ملنا ہے
موت کے راستے سے جائے گا
موت پُل ہے عبور کر کے جسے
وصلِ جاناں نصیب ہوگا تمھیں
موت ساغر ہے نوش کر کے جسے
تم ملاقاتِ رب کو جاؤ گے
جو نہ گزرے گا موت کے در سے
باغِ جنت کو پا نہیں سکتا
مثلِ دیوار ہے تمھاری جاں
یہ گرے گی تو موت آئے گی
موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر
موت اک انقلابِ عالم ہے
موت ہے خاتمہ مصائب کا
موت لذات کو کچلتی ہے
موت ہے انت آرزوؤں کا
موت ہے مرحلہ بہت مشکل

موت کا خوف شرطِ ایماں ہے
موت کا تذکرہ رہے جاری
موت خاموش ایک واعظ ہے
موت اُن کو عزیز ہوتی ہے
وہ جو کچھ زادِ راہ رکھتے ہیں
موت سے ان کی جاں نکلتی ہے
وہ جو رختِ سفر نہیں رکھتے
(ص:82 تا84)

اس کے بعد ایک اور غزل کے چار اشعار بہ ایں حوالہ اپنی طرف توجہ مبذول کرا رہے ہیں جو ذیل میں مندرج ہیں۔

چاند چہروں سے دوستی نہ ہوئی
مہرباں ہم پہ زندگی نہ ہوئی
بے تکلف رہی تِری خواہش
ایک لمحے کو اجنبی نہ ہوئی
ہم نے خود کو جلا کے دیکھ لیا
ختم اس گھر کی تیرگی نہ ہوئی
کیا کریں ناز اپنی قسمت پر
اس میں فاتحؔ جو دلبری نہ ہوئی
(ص:88)

غزل کے مطلع میں حسن کو لازمہء حیات کے طور پر لیا گیا ہے جو اس صورت میں قربت عطا کرتا ہے۔ جب زندگی یا قسمت مہربان ہوتی ہے لیکن صد افسوس کہ ایسا نہ ہو

سکا دراصل یہ شعر خود میں جمالیاتی و رومانوی پہلو لیے ہوئے ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خفیف سی حزنیہ کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ شعر ثانی میں آرزوئے یار کے بے تکلف ہونے کا ذکر ہے جو کبھی ذرا دیر کو بھی اجنبی نہ ہو سکی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جمالِ یار تھا ہی ایسا رومان پرور اور جاذبِ نظر کہ ذرا دیر بھی اس سے غافل نہ ہو سکا۔ شعرِ ثالث میں اندھیروں کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ اس کے لیے خود بھی شعلہ زن ہو گئے مگر گھر کی تیرہ بختی کا یہ حال تھا کہ اس کی ظلمتوں میں ذرا بھی کمی واقع نہ ہوئی۔ جبری پہلو کا ایک رنگ یہاں خود آزاری و خود اذیتی حتیٰ کہ وارفتگی کے تاثرات بھی رکھتا ہے جو خود پر جبر یعنی جبرِ ذات کے زمرے میں آتا ہے۔ غزل کا مقطع بھی جبرِ قسمت کا حامل ہے۔ ہم تو اپنی قسمت پر بھی ناز نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں مرقوم ہی نہیں تھا کہ کوئی زہرہ جمال ہماری دلبری و دلداری کرتا۔

اس سے آگے ایک اور غزل کے تمام اشعار جبری حوالوں کے نمائندہ ہیں۔ بدونِ تبصرہ ہم اسے سپردِ قارئین کرتے ہیں۔

حسرتِ دل کبھی نئی نہ ہوئی
ختم سوچوں کی گمرہی نہ ہوئی
سخت احساسِ رائیگانی ہوا
ہم سے جس روز شاعری نہ ہوئی
ان کے ہاں بارہا بلائے گئے
اور تقریبِ مئے کشی نہ ہوئی
سینکڑوں قمقمے ہوئے روشن
اپنی آنکھوں میں روشنی نہ ہوئی
رب کو ناراض کر دیا میں نے

مجھ سے راضی مِری سکھی نہ ہوئی
جاں ہماری جو چھوڑتی ہی نہیں
لوط بوٹی ہوئی ، بدی نہ ہوئی
جس پہ فاتحؔ نکل پڑے آنسو
کوئی حسرت ہوئی ، خوشی نہ ہوئی
(ص:89)

مزید آگے بڑھیے تو شعروں کی ایک جوڑی بحوالہ جبر یِ توجہ منعطف کرا رہی ہے۔

اب یہی ہوتا ہے محسوس کہ جیسے میں نے
غم کو دل ، بے کلی کو جان بنا رکھا ہے
زندگی ویسے بھی دشوار ہے جانِ فاتحؔ
آپ نے مرنا تو آسان بنا رکھا ہے
(ص:90)

محسوسات کا ایک عجیب سلسلہ ہے جسے جبرِ ذات پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ہم نے غم کو دل بنالیا ہے یعنی دل کو سراپا غم کر دیا ہے۔مقطع میں دشواریٔ حیات کو معمولی قرار دیتے ہوئے محبوب کی سپاس گزاری کی گئی ہے کہ یہ سارا تیرا لطف و کرم ہے کہ مرجانا ہمارے لیے سہل تر ہو گیا ہے۔

اس سے بعد والی غزل میں چار اشعار جبری حوالے سے پائے جاتے ہیں جو کچھ یوں ہیں۔

دل میں سجایا ہے جسے تصویر کی طرح
مجھ سے خفا ہے وہ مِری تقدیر کی طرح
تیری نگاہِ ناز تھی یا برقِ آسماں

جو دل کے آر پار ہوئی تیر کی طرح
اپنی وفا کہوں اِسے یا تیرا دامِ زلف
جکڑے ہوئے ہے جو مجھے زنجیر کی طرح
تیرے بغیر کیوں نہ ہو تاریک میری رات
ہے نورِ شمع کب تِری تنویر کی طرح
(ص:91-92)

ہم نے جس محبوب کو دل کی آرٹ گیلری میں تصویر کی طرح سجا رکھا ہے، ستم دیکھیے کہ وہ اس طرح خفا رہتا ہے جیسے ہماری قسمت روٹھی ہوئی ہو۔ لہٰذا اسے ہم رومانوی جبر قرار دے سکتے ہیں۔ یا پھر جبر کا بحوالہ قسمت ٹھہرا سکتے ہیں۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ وہ آسمانی بجلی تھی یا تیری نگاہِ ناز جو کسی تیر کی طرح دل کے آر پار ہوگئی۔ میں خیال کر رہا ہوں کہ یہ تیری زلف کا دام ہے یا پھر اپنی وفا ہے جس نے مجھے زنجیر کی طرح جکڑ رکھا ہے۔ دراصل یہ جبرِ سرشت کا حوالہ ہے تو شریکِ انجمن نہیں، یہ تو میری ذات کسی شبِ ظلمت سے کم نہیں ہے۔ حالانکہ چراغ روشن ہیں پھر بھی تیرگی نہیں جاتی۔ سبب یہ ہے کہ کہ شمع کی روشنی تیرے رخِ جمال کے نور کی طرح نہیں ہوسکتی۔ اسے آپ شبِ فرقت کی تیرگی قرار دے سکتے ہیں جو جبرِ عشق سے کم نہیں۔ درحقیقت یہ پوری غزل اپنی ردیف ''کی طرح'' کی وجہ سے تشبیہاتی رنگ کی حامل ہے۔

اس کے بعد والی غزل کا ایک شعر ہمارے موضوع سے مطابقت رکھتا ہے۔

اب نہیں غم جھیلنے کی تاب جانِ زار میں
آپ سے درد و الم اے جانِ من کافی ملے
(ص:94)

اے دوست آپ نے مسلسل ہمیں رنج والم سے نوازا ہے۔ دکھ جھیلتے جھیلتے ہم نحیف و

نزار ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اب مزید آلام کا سامنا نہیں کر سکتے۔ یہاں بھی جبرِ عشق کارفرما ہے۔شعر ہذا بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

غزل مابعد میں مسئلہء جبر سے متعلق تین اشعار لائقِ توجہ ہیں۔

میں سادہ لوح انساں جس دم گیا چمن میں
گل کی بجائے اپنے دامن میں خار لایا
رسوائی کا یہ طوفاں ہرسو جو دیکھتے ہو
کچھ لائی چشمِ پرنم ، کچھ رازدار لایا
جس طرح اک شرر سے جل جائے سارا خرمن
کیا کیا بلائیں فاتح یہ قلبِ زار لایا

(ص:96)

شعر اول میں سادہ لوحی مجبوری بنی ہوئی ہے جس کے باعث کام الٹے پڑ رہے ہیں۔ شعر ثانی میں رسوائی باعثِ مجبوری ٹھہری ہے جس میں کچھ قصور ہمارے دیدۂ اشک بار کا ہے اور کچھ قصور پیٹ کے ہلکے رازدار کا ہے۔شعرِ ثالث قلبِ زار کو جبری حوالہ بنا رہا ہے جس کے باعث ہمیں اتنی مشکلات ومصائب سے گزرنا پڑا ہے۔

اس سے بعد والی غزل میں اس نوعیت کا ایک شعر موجود ہے۔

میں کتنا ہوں خوش قسمت ، جلوے ہیں مِرے جویا
بجلی نے جلایا ہے اک میرا ہی کاشانہ

(ص:98)

حیرت ناک بات یہ ہے کہ عالمِ زیاں کو بھی شاعر اپنی خوش نصیبی پر محمول کر رہا ہے۔ اس کے بقول وہ کتنا خوش قسمت ہے کہ بھرے چمن میں بجلیوں نے صرف اسی کا آشیانہ نذرِ

آتش کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تجلیات اس کی تلاش میں رہتی ہیں۔ جبر کے عالمِ غم سے مسرت کا پہلو تلاش کرنا شاعر کی رجائیت پسندی کا بہترین مظہر ہے۔

گیت عام طور پر خود میں شادمانی و مسرت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن عجب کی بات یہ ہے کہ یہ گیت تمام و کمال جبری امکانات لیے ہوئے ہے جسے ہم بدونِ تبصرہ قارئین کی خیال آرائی کی نذر کرتے ہیں۔

تنہائی ہی تنہائی ہے
ساجن ہے نہ کوئی سہیلی
اجڑا اجڑا سا ہے گلشن
سونا سونا سا ہے آنگن
لگتی ہے ویران حویلی

---

پاس مِرے دل دار نہیں ہے
کوئی بھی غمخوار نہیں ہے
سلگا کرتی ہوں میں اکیلی

---

نندیا ساری رین نہ آئے
دن بھر مجھ کو چین نہ آئے
کیسا کھیل تھا جو میں کھیلی

---

کتنے دکھ ہیں کتنے غم ہیں
بچنے کی امیدیں کم ہیں

ناگن بن گئی رات البیلی

---

باغِ وفا پامال ہوا ہے
غم سے یہ مِرا حال ہوا ہے
جیسے مرجھائے کوئی چنبیلی

---

اُس سے حال پیار کا پوچھوں
لے کر نام خدا کا پوچھوں
جو بھی آئے نئی نویلی

---

کون ہے جو میرا دکھ جانے
کون ہے جو مجھ کو پہچانے
میں اَن بوجھی ایک پہیلی

(ص:115-116)

یہ دیکھا گیا ہے کہ شعراء ماقبل کے کلام میں مسئلہ جبر وقدر بے حد گھمبیر حالت میں پایا جاتا ہے جس سے خاصی پریشانی کا پہلو عیاں ہوتا ہے اور صورتِ حال بہت سنگین محسوس ہوتی ہے لیکن ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں یہ مسئلہ فطری انداز میں پایا جاتا ہے جس میں بعض اوقات تو خوشگوار پہلو نکلتے ہیں۔ مثلاً بقول خواجہ حافظ شیرازی:

در کوئے نیک نامی مارا گزر نہ دادن
گر تو نہ می پسندی تغیر کن قضارا

یعنی نیک نامی کے کوچے میں ہمیں قدم ہی نہیں رکھنے دیا گیا، اگر تجھے یہ پسند نہیں تو

میری تقدیر کو ہی بدل دے۔

اسی طرح میر نے کہا تھا:

چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں
ہم کو عبث بدنام کیا

لیکن ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا انداز بسلسلہ ہذا قطعی مختلف و منفرد ہے۔ جیسے:

میں کتنا ہوں خوش قسمت، جلوے ہیں مِرے جو یا
بجلی نے جلایا ہے اک میرا ہی کاشانہ

(ص:98)

چنانچہ قبل ازیں جو صراحتیں استشہادات کی روشنی میں ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن میں ان کی نسبت سے پیش کی جا چکی ہیں وہ بھی تمام تر ان کی انفرادیت کی شاہدِ عادل ہیں۔ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ دیگر شعرا کے ہاں جبری عوامل یاسیت وقنوطیت کی طرف لے جاتے ہیں جبکہ موصوف کے ہاں رجائیت پسندی، زندہ دلی اور مردانگی کے پہلو نظر آتے ہیں۔ مزید برآں زیادہ سے زیادہ کہیں نہ کہیں احساسِ زیاں اور آشوبِ عصر کی ترجمانی ہوتی ہے۔ بعض اشعار میں تو ذہنی بیداری، تحریک طلبی اور سوچ بچار کے عناصر مستولی نظر آتے ہیں۔ گویا ان کا کلام دعوت آمیز اور فکر انگیز نوعیت کا حامل محسوس ہوتا ہے جس کے باعث ان کی اپنے قاری پر گرفت مضبوط ہوتی ہے اور مقبولیت و دلپذیری کے ابواب وا ہوتے ہیں۔ یوں ان کا شعری کینوس لایعنیت اور عدم مقصدیت سے گریزاں ہے۔ مقصدیت کی بالادستی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کی شاعری نظریہء شعر گفتن برائے شعر کے تحت نہیں ہے بلکہ خود میں وسیع تر افادی پہلو سموئے ہوئے ہے۔ امیدِ واثق ہے کہ فردائی ادوار میں ان کے سخن کی نہ صرف تحقیقی و تنقیدی اہمیت دو چند ہوگی بلکہ انہیں بھرپور انداز میں سراہا بھی جائے گا۔ ناقدین و محققین کو ان کے

کلام کی تفہیم کے لیے وسیع تر باریک بینی اور نفسیاتی ادراکات کی ضرورت ہوگی۔ یوں قاری پر ان کے سخن کے آفاق و اعماق کے ابواب وا ہوں گے۔ ان کی شاعری فزوں تر فطری رچاؤ کی حامل ہونے کے باعث قاری کے حواس کو مکمل طور پر مستعد رکھنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ یوں بڑے اعتماد کی فضا میں ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ آنے والا دور یقیناً ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا ہی ہوگا۔ اس سلسلے میں نہ صرف انہیں اپنی فکری وفنی ریاضت کو جاری و ساری رکھ کر اپنی کشیدِ جاں کے جواہر بھی لٹانے ہوں گے اور محققین و ناقدین کو بھی اپنے حصے کا بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا۔

؎ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

## باب دوم

# ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کلام
# امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے پس منظر میں

شخصی لحاظ سے ابوالبیان ظہور احمد فاتح عندالملاقات ایک ہنس مکھ اور عام دنیا دار آدمی نظر آتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے اندر کہیں نہ کہیں کوئی مولوی صاحب چھپے بیٹھے ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنا رنگ دکھاتے رہتے ہیں۔ وہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی اجازت سے برموقع گفتگو فرماتے ہیں تاہم انہیں مجموعی طور پر بالادستی حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ فاتح میں موقع محل کے اعتبار سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے خوبصورت مظاہر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ جس سے اپنی قوم اور اپنے ملک کی بھلائی و خیر خواہی مطلوب ہے۔ نیز رب کی رضا کے شایان اپنے سخن کو بنانا مطلوب نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے احساس میں یہ بات جاگزیں ہو کہ قیامت کے روز میزانِ عدل میں ان کا سخن ان کے لیے باعثِ گرفت نہ ہو بلکہ باعثِ نجات ثابت ہو سکے اور شعر و سخن کے حوالے سے کہیں مالکِ حقیقی کے حضور شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں دینی عناصر مثلاً حمد و نعت، مناقب اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے موضوعات باافراط پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں اپنی تصنیف ''ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی تخلیقی ترجیحات'' مطبوعہ 2023ء میں ان نے نظریہءادب برائے زندگی کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔ لہٰذا وہ ادب

کی مقصدیت اورافادی پہلو کے پورے طور پر قائل ومائل ہیں۔

آگے چل کر ہم ابو البیان ظہور احمد فاتح کے تازہ ترین مجموعہء کلام ''صبحِ بہاراں'' مطبوعہ 2022ء کی روشنی میں منتخب شعری استشہادات امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے حوالے سے استخراجی جائزہ لیں گے۔ یہاں ہماری یہ بھی شعوری کوشش ہوگی کہ ہم فکری وفنی دونوں حوالوں سے تمام تر تجزیاتی تناظرات قارئین کے سامنے لائیں تاکہ مجموعہ انتقادی تاثر کواجاگر کیا جاسکے۔

خوشگوارزندگی گزارنے کے لیےاورراہِ راست پر چلنے کے لیے بھلی بھلی باتیں کرنااور نیکی کا حکم دینا بہت ضروری ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ برائی سے روکنا بھی ناگزیر ہے۔ یہی اللہ کا حکم ہےاور اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ ہے۔ یہی اہلِ علم اوراہلِ شعور کا منصب ہے۔ چنانچہ ایک شاعر بھی جوقوم کے حساس طبقے سے تعلق رکھتا ہے،جس کی بات سنی جاتی ہے،اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل پیرا ہو۔لہٰذا ابوالبیان ظہوراحمد فاتح بھی عموماًاس کوشش میں رہتے ہیں کہ موقع بہ موقع یہ مقدس فریضہ ادا ہوتا رہے۔ یہی اس کا ثبوت ہے کہ ان کے کلام میں جگہ جگہ ایسے شواہد ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔کتاب ''صبحِ بہاراں'' کی پہلی نظم جونظمِ معریٰ میں کہی گئی گھے،جس کا عنوان ''المتکبر'' ہے، کاایک ابتدائی اقتباس ملاحظہ ہو۔نظم ہذا بحر ہزج مسدس محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

وہ بولا ہے تکبر میری چادر
تکبر کرنے والا ہے جو انساں
وہ گویا میری چادر کھینچتا ہے
(ص:11)

ایک نظم بعنوان ''دعا'' کاایک شعر دیکھیے۔واضح رہے کہ یہ نظم غزل کی ہیئت میں کہی

گئی ہے۔

کرتا رہوں ادا ترے بندوں کے میں حقوق
یارب! مجھے خلوصِ عبادت نصیب ہو

(ص:13)

یہ شعر حقوق العباد اور حقوق اللہ کا امتزاجی رنگ لیے ہوئے ہے۔ ان دونوں کو بڑی خوبصورتی سے ایک شعر میں مجتمع کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ امر بالمعروف بھی حقوق العباد کا لازمی حصہ ہے۔

اس کے بعد ایک مختصر نظم ''آذان'' سے معنون بدون تبصرہ پیش کی جاتی ہے جو پوری کی پوری امر بالمعروف پر مشتمل ہے۔

اے مسلماں، متقی بن، حق سے رشتہ جوڑ دے
باز آ بدکاریوں سے راہِ شیطاں چھوڑ دے
اے کہ اٹھ بن کر مجاہد، چھوڑ دے عیاشیاں
پے بہ پے ضربوں سے دیوِ کفر کا سر پھوڑ دے
اس سے پہلے کہ ترا دشمن ہو تجھ پر تیغ زن
اٹھ! سنبھل اور اپنے دشمن کی کلائی موڑ دے
پھر سے اپنا عدلِ فاروقی و زورِ حیدری
ظالموں کا سر کچل دے، زورِ باطل توڑ دے

(ص:14)

آگے چلتے ہیں تو ایک غزل کا مقطع اس رنگ کا حامل دامنِ توجہ کھینچ رہا ہے۔

فاتحؔ نہ ہو سکے گا ذرا سا بھی حق ادا
جتنی بھی حمد کیجئے اُس بے نیاز کی

(ص:18)

انسان کے لیے لازم ہے کہ اپنے مالک وخالق ورازق کی حمد وثنا کرتا رہے اور اس کے ذکرِ جمیل سے رطب اللسان رہے۔ غزل مابعد میں دو اشعار اسی حوالے سے ہیں۔ ایک نہی عن المنکر اور دوسرا امر بالمعروف پر مشتمل ہے۔

ہمارے درد کی بے شک ذرا دوا نہ کرو
کسی مقام پہ ہم سے مگر دغا نہ کرو
خدائے پاک سے مانگو جو چاہیے تم کو
علاوہ اس کے کہیں اور التجا نہ کرو

(ص:19)

شعر اول میں دھوکہ فریب کی نہی کی گئی ہے۔ تمہاری مرضی ہمارے دکھ درد کا علاج کرو یا نہ کرو، لیکن کہیں بھی کبھی ہمیں دھوکہ نہ دینا۔ کیونکہ دھوکہ دینا بڑی برائیوں میں سے ایک ہے۔ دوسرے شعر میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ تمہیں جو کچھ بھی مطلوب ہو، اپنے اللہ تبارک وتعالیٰ سے طلب کرو، کسی اور دروازے پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بات سب سے عظیم سورۃ یعنی سورۃ فاتحہ کی وسطی آیت میں سمجھائی گئی ہے۔ وایاک نعبد وایاک نستعین O اور ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔

اس کے بعد ایک اور غزل کا مقطع ملاحظہ کریں۔

فاتحؔ پیامِ فوق تھا اپنا کلامِ شوق
دنیا میں ہم خلوص و وفا کے نقیب تھے

یہ دراصل شاعر کا عرفانِ ذات ہے کہ ہم دنیا میں کیا کرتے رہے اور ہمارا کلام کس وضع کا تھا یعنی ہم نے جو محبت بھرا کلام پیشکیا، وہ فوقیت کے گر بتاتا تھا کہ کس طرح ہمیں رفعتوں پر پہنچنا ہے، ہم دنیا میں آئے تو درسِ خلوص ووفا دیتے اور تا حیات یہی

ذمہ داری نبھاتے رہے۔

اگلی غزل کے دو اشعار نہی عن المنکر کے زمرے میں آتے ہیں۔

غرور و فخر ذاتِ کبریا کو خوش نہیں آتا
نصیحت ہے مِری خود پر کبھی تم ناز مت کرنا
جو ہے افتادِ طبع خاص اس کو مستقل رکھنا
کبھی فاتحؔ طبعیت کو زمانہ ساز مت کرنا

(ص:27)

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ابو البیان ظہور احمد فاتحؔ کے ہاں امر بالمعروف کے حوالے سے زیادہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ان کا نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ اگر نیکیاں بڑھتی اور پھیلتی جائیں تو برائیاں سکڑتی اور کم پڑتی جائیں گی۔جیسے روشنی کے پھیلنے سے اندھیرا گریز پا ہو جاتا ہے۔شعر اول میں ایک نفسیاتی بیماری جسے احساسِ برتری کہتے ہیں، کی نفی کی گئی ہے۔اس لیے کہا گیا ہے کہ تکبر اور غرور ذاتِ باری تعالیٰ کو زیبا ہے۔اس کا فرمان ہے کہ تکبر میری چادر ہے اور جو کوئی غرور کرتا ہے، گویا وہ میری چادر کھینچتا ہے۔جو میری چادر کھینچتا ہے میں اسے ذلیل و رسوا کر دیتا ہوں۔شعر ثانی میں شاعر خود کو اور اپنے ہم قبیلہ اہلِ قلم لوگوں کو نصیحت کر رہا ہے کہ قدرت نے تمہیں جو افتادِ طبع عطا کی ہے، اس کے خواص کو ہمیشہ بحال رکھنا اور کبھی تم میں زمانہ سازی یعنی دنیا کے مطابق خود کو ڈھالنے کا انداز مت اختیار کرنا بلکہ اپنی انفرادیت ہمیشہ برقرار رکھنا۔غزل کی ردیف ''مت کرنا'' خود میں نہی عن المنکر کے وسیع تر امکانات رکھتی ہے۔ چنانچہ پوری غزل ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا رنگ لیے ہوئے ہے۔یہاں ہم نے یہ بھی جائزہ لیا ہے کہ ان کے ہاں ایک فکری تسلسل جو فطری رچاؤ کا آئینہ دار ہے۔ بہ حسن و خوبی پایا جاتا ہے۔گویا اگر امر بالمعروف کی کیفیت پائی جائے تو اور اگر نہی عن المنکر کا سماں ہو تو وہ خود میں ایک متاثر کن تسلسل رکھتا ہے۔مذکورہ اشعار بحر

ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے۔آگے چلیے تو ایک اور غزل میں ایک اور شعر امر بالمعروف کے حوالے سے توجہ منعکس کر رہا ہے۔

بیٹھے ہو تم خود میں مگن
سامانِ خود بینی لیے
ص28)

چھوٹی بحر کا یہ شعر ایک طویل سوچ کا سلسلہ رکھتا ہے۔مثل مشہور ہے کہ انسان معاشرتی حیوان ہے، گویا ہمیں کبھی اپنے سماج سے غافل نہیں ہونا۔مزید برآں ہم آئینہ تصور میں اپنے مالکِ حقیقی کے انوار مجتمع کریں اور آنکھیں کھلی رکھتے ہوئے سماجی ناہمواریوں پر نظر رکھیں۔کیونکہ شاعر اپنے سماج کا دیدۂ بینا ہوتا ہے۔لہٰذا ہم جو چبھتی ہوئی چیز محسوس کریں ، اس کا پرتو ضرور ہمارے سخن میں ہونا چاہیے۔مشہور واقعہ ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو سکندر کا بنا ہوا آئینہ چین سے تحفے میں بھیجا گیا۔اس سے وہ کبھی کبھی اپنا چہرۂ زیبا دیکھ لیا کرتے تھے۔ایک دفعہ ان کی ایک خادمہ گھبرائی ہوئی بحالِ پریشاں آئی اور ڈرتے ڈرتے عرض کی۔

؎ درِ قضا آئینۂ چینی شکست

شیخ اس پر خفا نہیں ہوئے بلکہ برجستہ فرمایا:

؎ خوب شد سامانِ خود بینی شکست

یعنی اچھا ہوا کہ خود کو دیکھنے کا سامان ٹوٹ گیا۔

مراد یہ ہے کہ اب دل کے آئینے میں جمالِ محبوب کی تجلیات دیکھا کریں یا کھلی آنکھوں سے اپنے معاشرے کے نشیب و فراز کا جائزہ لیں گے۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا یہ شعر ہمیں اس واقعہ کا عکاس محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ شعر ہذا براہِ

راست امر بالمعروف کا حوالہ نہیں ہے بلکہ بالواسطہ طور پر ایک ترغیب کا درجہ رکھتا ہے۔شعر ہذا بحر رجز مربع سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مستفعلن مستفعلن ہیں۔

غزل ازاں بعد موضوع کی نسبت سے دو شعر خود میں سموئے ہوئے ہے۔

ممکن جو نہیں دینا کوئی طفل تسلی
تم میری پریشانی کو دوچند نہ کرنا
جگ ترکِ تعلق پہ کرے جتنا بھی مجبور
اس بات پہ تم دل کو رضامند نہ کرنا

(ص:31)

غزل ہذا کے دونوں اشعار ردیف ''نہ کرنا'' کی بنا پر نہی عن المنکر کے مصداق ہیں اور دونوں شعر اخلاق و تہذیب کے نمائندہ ہیں۔شعر اول میں یہ کہا گیا ہے کہ پریشان حال شخص کو اگر تسلی نہیں دے سکتے تو نہ سہی، کم از کم اس کی پریشانی میں اضافہ تو نہیں کرنا چاہیے۔ شعر ثانی میں یہ کہا گیا ہے کہ اہلِ دنیا تمہیں ترکِ تعلق پر جتنا مجبور کریں، اپنے دل کو اس کارِ نامناسب پر ہرگز قائل و مائل نہ کرنا۔ چونکہ تعلقات بہت قیمتی ہیں، اس لیے ان کی پاسداری بہت ضروری ہے۔غزل مابعد بسلسلہ ہذا ایک شعر کی حامل ہے۔

اصل میں تو یہی اصلِ تہذیب ہے
میں مروت پہ کرتا جو اصرار ہوں

(ص:36)

اس میں مروت کرنے کی بااصرار تاکید کی گئی ہے اور سبب یہ بتایا گیا ہے کہ ضرورت ہی اصل تہذیب ہے۔اس لیے اپنی مروت سے پہلوتہی نہیں کرنی چاہیے۔انسان کو ہمیشہ بامروت رہنا چاہیے کیونکہ یہی انداز عنداللہ اور عندالناس پسندیدہ ہے۔بقول مولانا روم:

اصل تہذیب احترامِ آدم است

برتر از گردوں مقامِ آدم است

نظریہء ادب برائے زندگی کا مقصودِ خاص یہی ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا شعر مذکور بحر متدارک مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہیں۔ امر بالمعروف کی نسبت سے ایک اور غزل کا مقطع منقول ہے۔

پیار دو طرفہ ضروری ہے نہایت فاتح
وہ جو مولیٰ کا نہیں ایسے کا مولیٰ بھی نہیں

(ص:37)

معاملے کو چاہے دینی اعتبار سے دیکھا جائے یا دینوی لحاظ سے، دراصل محبت وہ پائیدار ہوتی ہے جو دونوں طرف سے کی جائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بھی اس سے محبت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کرتا ہے۔ اس طرح اگر عاشق اپنے محبوب کو دل و جان سے چاہتا ہے تو محبوب بھی اپنے چاہنے والے کی قدر کرتا ہے۔ بقول کسے:

الفت کا جب مزہ ہے کہ دونوں ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

دراصل یہ شعر خود میں ایک تمثیلی رنگ لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اس میں ابلاغیت کے فزوں تر امکانات پائے جاتے ہیں۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا شعرِ مذکور بحر رمل مثمن مخبون/ محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ فعلن ہے۔ واضح رہے کہ عروضی اعتبار سے عروض و ضرب میں ایک حرف کی کمی بیشی روا ہوتی ہے۔

اسی طرح غزل مابعد کا مقطع بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

آقاؤں کا آقا جو خدا اپنا ہے فاتح
ہے عہد اسی کو ہی شہنشاہ کریں گے

(ص:38)

محولہ بالا شعر بھی قربِ الٰہی کا مظہر ہے جسے معرفت وتصوف دونوں میدانوں میں لایا جا سکتا ہے۔ ہمارا ربِ حقیقی جو تمام آقاؤں کا آقا ہے، ہم بھی اسے ہی اپنا شہنشاہ جانیں گے۔ اس کے حضور محضرِ التجا پیش کریں گے۔ اسی کو پکاریں گے۔ اسی سے مانگیں گے اور اپنی تمام تر توقعات ذاتِ بابرکات سے وابستہ کریں گے۔ اس کے در کے سوا کہیں اور جبیں سائی ہرگز نہیں ہوگی۔ شعر ہذا بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں کہا گیا ہے۔ جس کے عروضی ارکان مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن ہیں۔

اسی زمرے سے تعلق رکھتا ہوا اگلی غزل کا مطلع دامنِ التفات کھینچ رہا ہے۔

طے ہے کہ سدا کارِ بہی خواہ کریں گے
اس عالمِ رنگیں کو نہ جنگاہ کریں گے

(ص:39)

یہ شعر خود میں ایک جہانِ معنویت سمیٹے ہوئے ہے۔ ہم نے یہ بات ٹھہرالی ہے کہ آئندہ ایک خیر خواہ کا کردار ادا کریں گے۔ یہ دنیائے رنگ و بو جو محبت کے قابل ہے، اس میں امن وامان قائم رکھیں گے اور کسی صورت اسے میدانِ جنگ نہ بنائیں گے۔ دراصل یہ شعر ایک دوغزلے میں سے دوسری غزل کا مطلع ہے جو ماقبل بحر و وزن میں کہا گیا ہے۔ غزل مابعد ایسے ہی دو اشعار کی حامل ہے۔

کرو گے توہینِ مصطفی تو ضرور ہم انتقام لیں گے
ہمارے جذبات کا کرو گے لہو تو اک روز جنگ ہو گی
کرو گے تم سرکشی اگر تو ضرور شر کے بھی در کھلیں گے
بنو گے فاتح جہاں میں تم تند خو تو اک روز جنگ ہو گی

(ص:41)

یہ دونوں شعر درحقیقت توہینِ مذہب کے حوالے سے ہیں جسے عرفِ عام میں بلاس

فیمی کہا جاتا ہے۔ان اشعار میں کفار ومشرکین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر تم ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے ادبی کرو گے تو ہم کسی صورت تمہیں نہیں چھوڑیں گے اور تمہیں تمہارے کیے کی سزا ضرور دیں گے۔ہم مسلمان کبھی کسی پیغمبر یا کتاب کی بے ادبی نہیں کرتے۔دوسروں کو بھی ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ایسا کریں۔اسی طرح دوسرے شعر میں بھی حسنِ تہذیب کا درس دیا جا رہا ہے۔اس کے لیے سرکشی اور تندخوئی چھوڑنا پڑے گی۔صلح صفائی اور باہمی رضاجوئی سے جیون بسر کرنا ہوگا نہیں تو شر پھیلے گا۔بدامنی عام ہوگی اور اندیشہ ہے کہ جہاں میدانِ جنگ میں تبدیل نہ ہو جائے۔غزل ہذا کی ردیف ''تو اک روز جنگ ہو گی'' خود میں کئی امکانات لیے ہوئے ہے جنہیں ہم عصری آشوب کا نام بھی دے سکتے ہیں اور حربی حوالہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔واضح رہے کہ ان اشعار میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے دروس پر عمل نہ کرنے کے سنگین نتائج سے متنبہ کیا گیا ہے۔یہ بھی نکیر کا ایک خوبصورت انداز ہے۔محولہ بالا اشعار مثمن وزن میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن ہیں۔واضح رہے کہ یہ وزن بحر رجز اور بحر کامل سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔بحر ہذا کا شمار بحورِ مستحدثہ میں ہوتا ہے اور یہ ایسی بحور ہیں جن کے اوزان دیگر بحور سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔تاحال اس بحر کو کوئی باضابطہ عروضی نام نہیں دیا جا سکا۔

غزل مابعد کا ایک شعر امر بالمعروف کے تناظر ہے۔

شکرِ پروردگار لازم ہے
دوست اس نے ہمیں دیے قابل

(ص:43)

شعر ہذا میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ اس نے ہمیں اچھے اور لائق دوستوں سے نوازا ہے کیونکہ اچھے دوست بھی قیمتی سرمایہ ہوا کرتے ہیں اور یہی دوستی

ہی انسان کی پہچان ہوا کرتی ہے۔ A man is known by the company he keeps ۔یعنی آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے ۔درحقیقت ناشکرہ پن اللہ تعالی کو پسند نہیں بلکہ وہ عبادِ مشکور کو ہی عزیز رکھتا ہے۔اس سے آگے والی غزل میں بھی ایک شعر اس حوالے کا موجود ہے

بناؤ خود کو رعایا پرور
سجاؤ گے سر پہ تاج کیسے ؟
(ص:58)

یہ شعر حسنِ سیاست کا موئید ہے۔اگر خود کو صاحبِ تخت و تاج بنانا ہے تو اُس کے لئے تمھیں رعایا پروری اور غریب نوازی یعنی خدمتِ خلق کے قرینے اپنانا ہوں گے۔ جیسے بمطابق حدیث گرامی:سید القوم خادمھم ۔یعنی کسی قوم کا سردار وہ ہوسکتا ہے جو اُس کا خدمت گزار ہو۔دراصل یہی آئینِ جہانگیری ہے۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

یعنی جو خدمت کرتا ہے وہی منصبِ مخدومی پر فائز ہوتا ہے شعر ہذا مربع وزن میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعلاتن مفاعلاتن ہے۔اس سے آگے والی غزل میں بھی ایک شعر اسی نوعیت کا جاگزیں ہے۔

جو چیز بھی مل جائے تشکر ہے ضروری
وہ دال ہو یا گوشت ہو گندم ہو کہ ہو جو
(ص:162)

اللہ تعالی بصورتِ رزق جو نعمت بھی ،عطا فرمادے،اُس کا شکریہ لازم ہے۔کیونکہ ہر نعمت کا اپنا مزہ ہوتا ہے اور اپنی ایک قدر و قیمت ہوتی ہے۔لہٰذا کسی نعمت کو بھی ادنیٰ سمجھ کر

ناشکری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔اللہ رب العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں :لا ان شکر تم لازیدنکم ۔یعنی شکر گزار بنو گے تو ہم اور زیادہ عطا فرمائیں گے۔

وان کفر تم ان عذابِ لا شدیدہ۔یعنی اگر تم کفرانِ نعمت کرو گے تو میرا عذاب بھی بہت سخت ہے گویا شکر گزاری کی جزا اور ناشکری کی سزا کا آیت ہذا میں بیان ہے۔

امر بالمعروف کی نسبت ایک اور شعر اگلی غزل کا ملاحظہ ہو۔

شرم کر اتنا تو اس گل ناز کو رسوا نہ کر
پیکرِ شرم و حیا ہے صاحبِ ناموس ہے
(ص:63)

شعر ہذا دراصل ایسے ندیدے عاشقوں کے لئے نصیحت ہے جو پردہ نشینوں اور باحیا خواتین کے لئے بدنامی ورسوائی کا باعث بنتے ہیں۔کہا گیا ہے کہ ایسے معصوم لوگوں کے لیے وجہء رسوائی بننا اور ان کی بھلی شہرت کو داغدار کرنا کسی ظلم عظمی سے کم نہیں۔درحقیقت یہ بھی عمدہ سماجی اقدار کے بروئے کار لانے کی ایک خوبصورت سوچ ہے جس کا مقصد خلقِ خدا کو اذیت اور پریشانی سے بچانا ہے کیونکہ بقول مولانا روم:

اصل تہذیب احترام آدم است ؟
برتر از گردوں مقامِ آدم است

ابو البیان ظہور احمد فاتح کا مذکورہ شعر بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ہے۔جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں۔عورتوں پر تشدد اور مار پیٹ دورِ قدیم سے جاہلی سماج کا طریقہ رہا ہے۔نظم ''زن کوبی'' جو نظمِ معریٰ میں قلم بند کی گئی ہے،عصرِ حاضر میں یہ قانون بھی بنایا گیا ہے جس کے مطابق ایسا فعل قبیح انجام دینے والوں کے لئے بطور سزا حد کڑی تجویز کی گئی ہے۔انھیں تھانے اور حوالات وغیرہ کی ہوا کھلائی جائے گی۔یہ نظم بحر ہزج مسدس محزوف میں کہی گئی ہے۔جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن

ہے۔ بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین کی جاتی ہے۔

ارے یہ کونسی انسانیت ہے
کہ تم کمزور عورت پر ہو جابر
تمہاری کیا یہی مردانگی ہے
ستم ڈھاتے ہو عاجز عورتوں پر
اٹھاتے ہو غضب میں ہاتھ ان پر
تمھارا یہ سلوکِ قاہرانہ
تمھارا یہ رویہ قہرمانہ
حقیقت میں مذمت کے ہے قابل
بنانا صنفِ نازک کو نشانہ
تمھارا یہ طریقِ جابرانہ
حقیقت میں یہ لائق ہے سزا کا
کرو تبدیل اس طرزِ عمل کو
یہ فرسودہ چلن ہے اس کو بدلو
مساوات و محبت ہے ضروری
مواسات و مروت ہے ضروری
کہ تہذیب و شرافت ہے ضروری

(ص:64)

آمدہ غزل کا مطلع موضوعِ مذکور کے حوالے سے لائقِ توجہ ہے۔

تری تباہی کا رازِ واحد کتاب سے بے تمسکی ہے
حدیثِ مرسل سے تو ہے غافل سو تیری گزران بے تکی ہے

(ص:68)

اس شعر میں بندۂ مسلم کو خطاب کیا گیا ہے اور واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ تجھے کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تمسک ناگزیر ہے مگر تُو نے اس کی ربط وضبط کی پرواہ نہیں کی چنانچہ تیری غفلت کے باعث تیری ساری گزران بے تکی ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس زوال آمیز انداز کا حل یہ ہے کہ مضبوطی سے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح قرآن وسنت پر عمل کرنا شدومد سے شروع کردے۔

واضح رہے کہ رسول ختمی مرتبت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے، کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ شعر ہذا بھی اسی ارشادِ گرامی کا آئینہ دار ہے۔ شعر ہذا مثمن وزن میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن ہیں۔ یاد رہے کہ یہ وزن بحر رجز اور بحر کامل سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس بحر کا شمار بحورِ مستحدثہ میں ہوتا ہے اور یہ ایسی بحور ہیں جن کے اوزان دیگر بحروں سے حاصل کیے جاتے ہیں۔

آگے بڑھیے تو امر بالمعروف کے حوالے سے ایک شعر آئندہ غزل میں دستک دے رہا ہے، جو کچھ یوں ہے:

خدا ہی جانتا ہے حال نیتوں کے مگر
نتیجہ جو بھی ہو کوشش ضرور کی جائے

(ص:80)

شعر ہذا بھی امر بالمعروف کی ایک عمدہ مثال ہے۔ حدیثِ مرسل ہے: انما الاعمال النیات۔ یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ لہٰذا خالص نیت کے ساتھ آغازِ کار کرنا چاہیے۔ ایک بھرپور کوشش ضرور کی جائے۔ نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا ہی ایک اور شعر اس کا موئید ہے۔

ہمارا کام ہے پانی پلانا
درختوں پر ثمر آئے نہ آئے

بقول سلطان باہوؒ:

مالی دا کم پانی ڈیون بھر بھر مشکاں لاوے ہو
مالک دا کم پھل پُھل لاون لاوے یا نہ لاوے

یعنی انسان صرف محنت کا مکلف ہے۔ نتیجہ قدرت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ بقول کسے:

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر انجام اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

غزل مابعد میں بھی اسی زمرے کا ایک بھرپور شعر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ منشیات ہیں دشمن دماغ و دانش کے
لیا نہ جائے دھواں اور مے نہ پی جائے
(ص:81)

نہی عن المنکر کے حوالے سے ایک مدلل شعر ہے جس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ منشیات و مسکرات انسان کے لیے سخت مضر رساں ہیں۔ ان سے انسانی صحت خراب ہوتی ہے۔ دماغ متاثر ہوتا ہے اور اکتسابِ علم میں بھی حرج واقع ہوتا ہے۔ اس لیے نشہ کسی صورت میں بھی چاہے وہ دھوئیں کی صورت میں ہو یا شراب کی صورت، کسی صورت میں بھی نشہ وار انہیں کھاتا اور اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ہمارے سماج کو مسکرات و منشیات شدید نقصان پہنچا رہے ہیں۔ خصوصاً نسلِ نو کی تباہی اسی کے باعث ہے۔ کتنے خاندان ان کی وجہ سے اجڑ گئے ہیں۔ کتنی بناتِ خدا کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ خدا ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

آگے بڑھیے تو ایک مکمل نظم امر بالمعروف کی مظہر ہے جس کا عنوان ''صبر و ضبط''

ہے۔ اور یہ ایک ایسی قدر ہے جو اللہ رب العزت کو بہت پسند ہے۔ بہت کچھ اس حوالے سے لکھا جا سکتا ہے۔ ہم بلاتبصرہ سپردِ قارئین کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ نظم ہذا مثنوی کی ہیئت میں رقم کی گئی ہے۔ یہ نظم بحر متدارک مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہیں۔

صبر کر صبر ہے دین کا لازمہ
یہ نہ ہو تو ہے ایمان کا خاتمہ
دیکھ ماتم نہ کر آہ و زاری نہ کر
خود یہ خود ساختہ سوگواری نہ کر
صبر کر ہے یہ تاکید قرآن کی
صبر کھینچے گا امداد رحمان کی
ناصبوری نبیؐ کو گوارا نہیں
جس نے ماتم کیا وہ ہمارا نہیں
صبر کرنا یقیناً بڑا کام ہے
وہ جو صابر نہیں بندۂ خام ہے
دین دیتا ہے درسِ متانت ہمیں
نوحہ کرنے کی کب ہے اجازت ہمیں؟
دی گئی ہم کو تعلیمِ سنجیدگی
ہے تحمل میں ایماں کی بالیدگی
بین کر کے نہ رو سینہ کوبی نہ کر
نوچ زلفیں نہ تُو چہرہ کوبی نہ کر
رنج و غم ہو کوئی یا مصیبت کوئی

ہم کو بھولے نہ صبر و تحمل کبھی

(ص:127-128)

مزید برآں ایک اور نظم بعنوان ''نصیحت'' امر بالمعروف کے حوالے سے ہماری منتظر ہے جو نظم کی عصرِ حاضر میں مقبولِ عام ہیئت یعنی غزل میں رقم کی گئی ہے۔ جس کا تبصرہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ نظم ایک مثمن وزن میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن ہیں۔

ضرور علم و ہنر میں اک دست گاہ پیدا کرو عزیزو!
ضرور شعر و ادب سے اک رسم و راہ پیدا کرو عزیزو!
ہو جس میں سوز و گداز ایسا کہ موم ہو جائیں سنگ دل بھی
وہ اشک پیدا کرو عزیزو! ، وہ آہ پیدا کرو عزیزو!
قدم بڑھاؤ جو سوئے منزل ، تو زیرپا ہو ضرور منزل
وہ شوق پیدا کرو عزیزو ، وہ چاہ پیدا کرو عزیزو!
کرے جو تسخیر بحر و بر کو ، فصیل و در کو ، دل و نظر کو
یقین و عزم و عمل کی ایسی سپاہ پیدا کرو عزیزو!
اگر ہے رہنا مثالِ فاتحؔ مجاہد و حق شناس بن کر
تو شیر جیسا جگر ، عقابی نگاہ پیدا کرو عزیزو!

(ص:145)

ان وسیع تر استشہادات کی روشنی میں یہ امر بین ہو جاتا ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ کے ہاں حکمتِ شعر اور فنی مقصدیت کا وفور پایا جاتا ہے۔ خصوصاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حوالے سے بہت سے اشعار ملتے ہیں جو قدم قدم پر قارئین کی رہنمائی کا منصب ادا کرتے ہیں اور اگر دیکھا جائے تو عصرِ حاضر میں خصوصاً اس کی شدید ضرورت بھی ہے جبکہ

اعمال وافعال کی آوارگی عروج کو پہنچی ہوئی ہے اور اذہان یہ فیصلہ لینے سے قاصر ہیں کہ زندگی کرنے کے لیے کون سی حکمتِ عملی زیادہ کارگر اور مفید ثابت ہوگی۔ لہٰذا ہمارے خیال میں ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے احساسِ جواب دہی کا خاصا خیال رکھا ہے۔ اگر روزِ محشر اس دن کا منصبِ اعلیٰ یہ پوچھ لے کہ ہم نے تمہیں شعر وسخن کا ملکہ عطا کیا تھا، اس کا حق کیسے ادا کیا تو کم از کم ان کے ہاں ایسے شواہد ان کے لیے باعثِ نجات ثابت ہو سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ امر بالمعروف دینی وقومی اور سماجی اعتبار سے افادی پہلوؤں کا حامل ہے۔ قرآن مجید کی حکمت اور حکمتِ حدیث سے اس کی بخوبی صراحت ہوتی ہے۔ مقصدیتِ حیات کے لیے بھی یہ ناگزیر ہے اور عوامی رہنمائی کے لیے بھی یہ بہت شاندار ہے۔ اس میں اصلاحی و فلاحی دونوں پہلو بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ مزید برآں فروغِ مقصدیت کا دارومدار بھی اسی پر ہے جسے ہم اب برائے زندگی کا لازمہ قرار دے سکتے ہیں۔

# ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں زمانہ شناسی

سیانے کہہ گئے ہیں:

لباسِ خضر میں یاں سینکڑوں رہزن بھی رہتے ہیں
اگر دنیا میں رہنا ہے تو کچھ پہچان پیدا کر

دنیا میں صحیح وسلامت زندگی بسر کرنے کے لیے زمانہ شناسی بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ایک اچھا شاعر اپنے قارئین کو عصری شعور، آگہی اور ادراکاتِ عالم سے بہرہ ور کرتا ہے تاکہ وہ کامل شعور اور عرفانِ عصر کی روشنی میں بہ حسن و خوبی زندگی گزار سکے۔کسی کے فریب کا شکار نہ ہو۔ بلکہ دانش مندی کے ساتھ اوقاتِ حیات بسر کرے۔فارسی کی مشہور مثال ہے ”تو زمانہ ساز دتو بہ زمانہ ساز“ یعنی زمانہ تجھ سے بنا بنا کے نہیں رکھے گا، بلکہ تجھے زمانے سے بنانا پڑے گا۔دنیا میں ہزاروں نشیب وفراز آتے رہتے ہیں۔اگر سادہ لوح عوام کی رہنمائی نہ کی جائے تو وہ کسی نہ کسی موڑ پر کسی فریب میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ایک شاعر جو دیدۂ بینائے قوم کا درجہ رکھتا ہے،اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو سمجھاتا بجھاتا رہے اور اسے کسی افراط وتفریط میں مبتلا نہ ہونے دے۔ چنانچہ بہ حیثیت شاعر بامقصد ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے بھی اپنے سخن میں جگہ جگہ اہلِ زمانہ کے چلن سے آگہی بخشی ہے۔ ذیل میں ہم ان کے مجموعہ ءکلام ”صبحِ بہاراں“ مطبوعہ 2022ء میں ایسے منتخب استشہادات برائے استخراجات سامنے لا رہے ہیں جن سے یہ امر

پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے کہ انہوں نے زمانہ شناسی کے دیپ جگہ جگہ روشن کیے ہیں۔

غزل مابعد میں زمانہ شناسی کے حوالے سے چار اشعار موجود ہیں۔ جنہیں ہم یہاں رقم کر رہے ہیں۔

اس کج ادا کے حیلے بہانے عجیب تھے
وہ پرخیال نین بلا کے خطیب تھے
حالات یوں بدل گئے حیرت ہمیں ہوئی
وہ آج ہیں رفیق جو اب تک رقیب تھے
ہر آدمی تہی لگا جب دردِ قوم سے
حامل عزائے قوم کے شاعر ادیب تھے
آنکھیں اسی خیال سے نمناک ہو گئیں
جو آج اتنے دور ہیں ، کتنے قریب تھے

(ص:20)

شعر اول میں محبوب کی اداؤں، اس کی حیلہ سازیوں اور عذر بہانوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے کیونکہ محبوب شناسی زمانہ شناسی کا ناگزیر پہلو ہے۔ شعر ثانی میں انقلابِ حال کا مذکور ہے اور ایسے لوگ جو طوطا چشم ہوتے ہیں، دفعتاً ان کے مکر جانے کا ذکر ہے۔ ابو البیان ظہور احمد فاتح کا ہی ایک شعر ہے۔

زمانہ مطلب پرست ہے لوگ بے وفا ہیں خیال رکھنا
یہ چاند چہرے سراب صورت ہیں کج ادا ہیں خیال رکھنا

شعرِ ثالث میں ایک عمومی مشاہدے کی بات کی گئی ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب دیکھا گیا کہ اکثر لوگوں کے اذہان وقلوب دردِ قوم سے تہی تھے تو ایسے عالم میں بھی شعراء و ادباء کا طبقہ دردِ قوم کا حامل تھا۔ مقصود یہ ہے کہ بندگانِ حساس ہونے کی نسبت سے قوم کے

شاعر وادیب ماشاءاللہ بھرپور قومی جذبہ رکھتے ہیں۔ گویا شعر ہذا میں اہلِ ادب کی حب الوطنی اور قومی حمیت کا اعتراف پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کی ایک لطیف صورت ہے۔ شعر رابع میں رومانی پہلو کی نسبت سے حساسیت پائی جاتی ہے۔ یعنی ان پیارے لوگوں کے خیال میں بارہا ہماری آنکھیں تر ہوگئیں جو کبھی ہمارے قریب تھے۔ شومئ قسمت وہ آج ہم سے دور ہیں۔ گویا اپنوں کا بیگانہ بن جانا بھی زمانے کے چلن کا حصہ ہے۔ ہر اہلِ دل کو اس کا ادراک ہونا چاہیے۔

تین شعر اور زمانہ شناسی کی نسبت سے اگلی غزل کے ملاحظہ ہوں۔

وہ بھی کیا دن کہ شیشۂ دل سب کا صاف تھا
کیا وقت آیا ہے کہ من سب کے کثیف ہیں
قسمت نے کی ہے یاوری اہلِ خلوص کی
کل تک جو تھے حریف وہ اپنے حلیف ہیں
ٹوٹا ہے جب سے ربط کتاب وحدیث سے
دیکھا ہے مومنوں کے عقائد ضعیف ہیں
(ص:21)

شعر اول میں اہلِ دنیا کے دلوں کے عالم کا زمانی اعتبار سے تقابلی جائزہ لیا گیا ہے کہ ایک وقت تھا جب لوگوں کے دلوں کے آئینے صاف وشفاف ہوا کرتے تھے۔ نہ ان میں گردِ کدورت ہوتا تھا اور نہ تعصّبات کا میل کچیل لیکن افسوس صد افسوس کہ عصرِ حاضر میں وہ کیفیت نہیں رہی بلکہ دلوں کے شیشے کثیف وآلودہ ہو چکے ہیں۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ شعر ثانی میں خوبیٔ قسمت کا تشکر ادا کیا جارہا ہے کہ آج کل قسمت مخلصین کا ساتھ دے رہی ہے یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کبھی مخالف ہوا کرتے تھے اب خدا کے فضل وکرم سے ہمارے حلیف بن چکے ہیں۔ یعنی اگر نصیب اچھے ہوں تو دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے

کہ آدمی اہلِ خلوص ہو گویا خلوص کو بالادستی حاصل ہے۔ شعر ثالث خالص دینی نوعیت کا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب سے مسلمان قرآن و حدیث کی نسبت سے ڈھیلے پڑے ہیں، یعنی ان کا ربط کتاب و سنت سے کمزور پڑا ہے، اس وقت سے وہ عقائد و اعمال کے لحاظ سے مبتلائے ضعف ہیں۔ دراصل یہ احساسِ زیاں کا بھی ایک مظہر ہے۔ یعنی تمسک بالکتاب والحدیث میں کمی دینی و دنیاوی اور سماجی و اقتصادی زیاں کا باعث ہے۔ جس کے سبب ہر نوع کا ارتقاء جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں معیشت رو بہ زوال ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کی طرف بھرپور توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ ہم اس خوف ناک زوال سے محفوظ و مامون رہ سکیں۔

زمانہ شناسی کے حوالے سے اگلی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

تو مجاہد ہے تو نمازی ہے
تو ہے جاں باز اور غازی ہے
(ص:23)

بندۂ مومن کے لیے یہ ایک بھرپور خراجِ تحسین ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ تجھ میں مجاہدانہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں تو بندۂ عابد بھی ہے کیونکہ تیری زندگی جانباز والی زندگی ہے۔ ملک و ملت کے لیے تو اپنی جان لڑا دیتا ہے اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نصرتِ الٰہی کے باعث تو مردِ غازی قرار پاتا ہے اور کامیابیاں تیرے قدم چومتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر شعر ہذا کو ہم عرفانِ ذات اور نازشِ ملت کے حوالے سے بھی لے سکتے ہیں۔ مزید برآں اس میں خودی و خود شناسی کے پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔ جنہیں عرفانِ ملک و ملت کا نام دے سکتے ہیں۔ مطلع ہذا بحرِ خفیف مسدس مخبون محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔

اگلی غزل میں سے زمانہ شناسی کے حوالے سے ایک شعر لائقِ توجہ ہے۔

نہیں ہے موجِ تبسم تری، صدا تیری
خدا گواہ کہ بن تیرے گھر ہے رنجیدہ
(ص:24)

شعر ہذا میں محبوب کی ہستی کے پر بہار اور دل نواز ہونے کی شہادت ہے یعنی اگر وہ موجود ہے تو گھر میں سرور وسکون ہے اور اگر وہ چلا جائے تو آزردگی اور افسردگی وافر ہو جاتی ہے۔ فضائے رنج والم طاری ہو جاتی ہے۔ یہ شعر ایک سگھڑ خاتونِ خانہ کی طرف مشیر بھی ہو سکتا ہے۔ کسی نے سچ کہا تھا کہ محبوبہ اگر بیوی ہو تو وہ محبوبہ نہیں رہتی اور اگر بیوی محبوبہ بن جائے تو وہ دل نواز ہو جاتی ہے۔ بقول شخصے:

دنیا بڑی باوری پتھر پوجن جاوے
نہ پوجے وہ چکی جس کا پیٹھا کھاوے

آمدہ غزل کا ایک شعر اسی زمانہ شناسی کے حوالے سے قابلِ ذکر ہے۔

جو بخلِ بحر دیکھا ہے
ہوا سائل پر پریشان ہے
(ص:26)

شعر ہذا کی ردیف بھی زمانہ شناسی کی بین دلیل ہے۔ مراد یہ ہے کہ اتنی وسعتوں کے باوجود سمندر میں بخل پایا جاتا ہے۔ یہ کیفیت ملاحظہ کر کے سائل کو سخت پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ کچھ پانے کی بجائے خود سے جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ کچھ لینے کی بجائے کچھ دینے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ گویا یہ شعر طبقہء متمول پر ایک بھرپور طعنہ ہے یعنی اصحابِ ثروت میں دریا دلی کا وہ عالم باقی نہیں رہا۔ شعر ہذا بحر ہزج مربع سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

غزل مابعد میں پانچ اشعار موضوعِ مذکور سے منسوب ہیں۔

منہ میں ہیں وہ چینی لئے
باتوں میں شیرینی لئے
رہتا ہے سنجیدہ بہت
اک فلسفہ دینی لئے
آتا ہے وہ کس شان سے!
چائے کی اک سینی لئے
بیٹھا لگائے گھات ہے
آنکھوں میں شاہینی لئے
فاتح تھا کتنا معتبر
افکار آئینی لئے

(ص:28)

شعراول محبوب کی شیریں بیانی کا موئید ہے۔شعرثانی میں مذہبی وسوچ کے حامل شخص کی طرف اشارہ ہے جس نے خود پر سنجیدگی اوڑھ رکھی ہے۔شعرثالث میں چائے پلانے والے بالفاظ دیگر ساقی کی تعریف کی گئی ہے۔شعررابع میں ایک شکاری طبعیت کے انسان پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کی آنکھوں میں شاہین جیسی چستی اور چمک دمک ہے اور گھات لگانے کا وہی انداز ہے۔شعرخامس جوغزل کا مقطع بھی ہے، میں کہا گیا ہے کہ فاتح جب تک آئینی افکار کا پرچار کرتا رہا، دنیا میں معتبر تھا لیکن جب سے دستوری باتیں کرنا اس نے چھوڑ دیں، اس کا وہ اعتبار وافتخار باقی نہیں ہے۔شعر ہذا خودشناسی کے ساتھ ساتھ عظمتِ کلام اور رفعتِ خیال کے پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔اس میں تعلیاتی تاثر بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔انتہائی مختصر وزن کی حامل یہ غزل شاعر کی ندرتِ کلام کا منہ بولتا ثبوت ہے۔غزل ہذا بحر رجز مربع سالم میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن مستفعلن مستفعلن ہے۔اس وزن

میں بہت کم طبع آزمائی کی گئی ہے۔

غزل مابعد میں زمانہ شناسی کی نسبت سے ایک شعر جاگزیں ہے۔

ہمارے حرف و معنی میں جو ضو ریزی ہے تابش ہے
نہ پاؤ گے چمک ایسی کسی موتی کسی دُر میں

(ص:29)

عرفانِ ذات کے حوالے سے یہ بہت عمدہ شعر ہے۔ شاعر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہمارا کلام چاہے ظاہری فنی تقاضوں سے دیکھا جائے یا معنوی لحاظ سے اس کا جائزہ لیا جائے، اس کی چمک دمک لعل و جواہر سے کہیں بڑھ کر ہے۔ گویا ہم نے ایسا فن تخلیق کیا ہے جو تادیر ضو ریز رہے گا۔ شعر ہذا بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

آمدہ غزل میں دو اشعار موضوعِ مذکور کی نسبت سے پائے جاتے ہیں۔

ذرا بھی ہچکچاہٹ کی نہ اظہارِ تشکر میں
اضافہ ہو گیا اس سے تری شانِ تہوُّر میں
خدایا اضطرابِ دل زیادہ ہوتا جاتا ہے
کمی آتی نہیں اہلِ زمانہ کے تناظر میں

(ص:30)

شکر ادا کرنا عمدہ تہذیبی وصف ہے۔ دینِ متین بھی ہمیں ادائے شکر کا درس دیتا ہے۔ اس سے انسان کی شان کم نہیں ہوتی بلکہ اس کے باعث عظمتِ انسانی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ذاتِ مشکور اور زیادہ راضی ہو جاتی ہے۔ یہی امر خوشگوار تعلقات کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ شعر ثانی میں دنیا میں رہتے ہوئے بے سکونی اور بے قراری کا اظہار ہے بلکہ کم ہونے کی بجائے اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر لوگوں کو رویہ تکلیف دہ ہو تو دل چھوٹا کرنے

کی بجائے صبرِ جمیل سے کام لینا چاہیے۔ زمانے سے نباہ کی یہی عمدہ تدبیر ہے جو اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی خاصی موثر ہے۔ درحقیقت شعر ہذا داخلی وخارجی دونوں پہلو رکھتا ہے جو اہلِ زمانہ کے رویے اور وارداتِ دل کی کیفیت کی طرف مشیر ہے۔ اشعار ہذا ماقبل بحر ووزن میں کہے گئے ہیں۔

آمدہ غزل میں اسی تناظر میں دو اور اشعار لائقِ التفات ہیں۔

خورسند نہ ہونا کبھی خورسند نہ کرنا
کیا سیکھا ہے پوری کوئی سوگند نہ کرنا
اس دور کے لوگوں کا یہی طور ہے فاتح
ملبوس کو شرمندۂ پیوند نہ کرنا

(ص:31)

شعر اول میں محبوب سے خطاب ہے کہ تو نے ساری قسمیں بھلا دی ہیں، نہ خود خوش ہوتا ہے اور نہ مجھے خوش ہونے دیتا ہے۔ حالانکہ بقائے باہمی کے اصولوں کے تحت وعدہ و پیمان کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ تاکہ تجھے بھی خوش رہنے کے مواقع میسر ہوں اور مجھے بھی سکھ سکون کی ساعتیں بہم ہوتیں۔ شعر ثانی میں لوگوں کی اس ادا کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ظاہری شان وشوکت اور خوش لباسی کی طرف متوجہ ہیں حالانکہ اگر کپڑے پھٹے پرانے ہو جائیں، ان پر پیوند لگانا قرینِ سنت ہے۔ اس شعر کا ایک عمدہ سماجی وعمرانی پس منظر بھی ہے کہ ہمیں اسلاف والی سادگی اختیار کرنی چاہیے اور خالی شوشا میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

غزل مابعد میں چار اشعار زمانہ شناسی کے حوالے سے پائے جاتے ہیں۔

میری دیوانگی ہے کہ ہے سادگی
اپنا دشمن ہوں یا تیرا غمخوار ہوں
تو گریزاں مِری گرم جوشی سے ہے

میں تِری سرد مہری سے بیزار ہوں
چاہے جس نام سے تم بلاؤ مجھے
جذب ہوں ، شوق ہوں ، عشق ہوں ، پیار ہوں
میں تو فاتح ستارا ہوں بجھتا ہوا
لوگ کہتے ہیں میں مثلِ مینار ہوں

(ص:35)

شعراول میں ایک ذاتی مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ میں اپنے بارے میں سوچتا ہوں کہ مجھ میں پائی جانے والی صفت سادگی ہے یا دیوانگی ہے نیز یہ بھی سمجھ نہیں آتا کہ میں خود سے دشمنی کررہا ہوں یا تجھ سے ہمدردی کررہا ہوں۔ آخراس جذبے کو کیا نام دوں؟ اس میں گومگو کا عالم بھی موجود ہے اوراسے ہم کسی حد تک فکری انتشار پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں مزاج شناسی کے حوالے سے عدم واقفیت کی کیفیت بھی جھلکتی ہے۔ دو متضاد امکانات دامن گیر ہیں اور شاعر کے لیے فیصلہ کرنے میں دشواری پیدا ہورہی ہے۔ کیونکہ دونوں عوامل اپنے اپنے طور پر خاصے مضبوط ہیں۔شعر ثانی میں شاعرایک اپنا وصف گنوار ہا ہے جو گرم جوشی ہے اورایک وصف محبوب کا شمار کررہا ہے جو سرد مہری ہے۔اس کا کہنا ہے کہ میری گرم جوشی سے میرا محبوب کنی کتراتا ہے اوراس کی سرد مہری سے میں بیزار ہوں گو یا وہ میرے مثبت وصف سے ناخوش ہے اور میں اس کے منفی وصف سے تنگ ہوں۔ یونہی ہمارے درمیان کشاکش کی ایک کیفیت رہتی ہے۔ البتہ مزاج شناسی کے حوالے سے دونوں یقینی امور ہیں۔ دراصل مزاج شناسی بھی زمانہ شناسی کا ایک لازمہ ہے۔شعر ثالث میں شاعر نے اپنے مختلف اسما کا حوالہ دیا ہے جو جذب،شوق،عشق اور پیار ہیں۔شاعر نے محبوب کو مجاز ٹھہرایا ہے کہ جو نام بھی اسے اچھا لگے،اسی نام سے اسے پکار سکتا ہے۔ گویا محبوب کے لیے سہولت وحسنِ انتخاب کا پہلو رکھا گیا ہے۔شعر ہذا میں رومانی اعتبار سے ایک

فضائے جاذبیت کارفرما ہے جسے ہم رومانوی تموج کا نام بھی دے سکتے ہیں۔غزل کا چوتھا شعر جو غزل کا مقطع بھی ہے، درحقیقت شعر ہذا میں تضادِفہمی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ میں خود کو ایک بجھتا ہوا ستارہ سمجھتا ہوں مگر یار لوگوں کی ایک خوش فہمی ہے کہ وہ مجھے مینارۂ نور قرار دیتے ہیں۔محسوس ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کی سوچ سے زیادہ اس کی قدر افزائی ہونے لگی ہے یا جیسا خراجِ تحسین اہلِ جہاں اسے پیش کرتے ہیں، وہ خود کو اس سے کم تر محسوس کرتا ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اہلِ جہاں کو ایک ندرت کے اتھ ان کے حسنِ ظن پر انہیں داد پیش کرر ہا ہو بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر اگر حقیقت پسندی سے بھی کام لے رہا ہے و اس میں بھی ایک افراط کا پہلو پایا جاتا ہے جسے حسنِ مبالغہ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔مزید برآں اس میں گہرائی و گیرائی کے تلازمے حسنِ بیاں کو چار چاند لگا رہے ہیں۔جسے فارسی میں کہتے ہیں یعنی مثل مشہور ہے،''من آنم کہ من دانم'' ......ایک دلچسپ نکتہ یہ بھی ہے کہ اس میں حدیثِ دیگراں کے انداز میں ایک دلچسپ تعلیاتی تاثر بھی پایا جاتا ہے۔اسے سخن ور کی طرف سے ایک لطیف گریز بھی قرار دے سکتے ہیں جو کسرِ نفسی کے انداز میں نفی تعلیات کا پہلو خود میں رکھتا ہے۔جسے عاجزی وانکساری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ از روئے تحقیق یہ ایک محتاط رائے ہے کہ کوئی جتنا زیادہ کسرِ نفسی اور عجز وانکسار سے کام لے گا، اتنا ہی زیادہ ترفع پر فائز ہوگا۔اسے ایک حد تک جمہوری انتقادی رائے بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔واقعی یہ ہے کہ یہ جملہ خصائص ابوالبیان ظہور احمد فاؔتح کے کلام میں جگہ جگہ جگمگاتے نظر آتے ہیں۔محولہ بالا اشعار بحر متدارک مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہے۔

اسی دوغزلے کا دوسرا حصہ زمانہ شناسی کے حامل تین اشعار پر مشتمل ہے۔

کتنا مفلس ہوں کتنا ملنسار ہوں
تجھ سے میں دوستی کا طلب گار ہوں

میرا اپنا ہی اک خاص دستور ہے
خود ہی دربار ہوں ، خود ہی سرکار ہوں
میری پرواز دیکھے گی دنیا ابھی
جانے والا ابھی میں افق پار ہوں

(ص:36)

پہلے شعر میں شاعر اپنے دو اوصافِ حمیدہ یعنی افلاس اور ملنساری کے حوالے سے بات آگے بڑھا رہا ہے اور یہ درخواست پیش کر رہا ہے کہ اس کے باوصف میں تجھ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں اب تیری مرضی ایک غریب آدمی کو اپنا دوست بنتا ہے یا نہیں۔ نیز ایک ملنسار آدمی کو اپنا بناتا ہے یا نہیں کیونکہ بعض اوقات زیادہ ملنساری بھی باعثِ گریز بن جاتی ہے۔ بقول شاعر:

خدایا جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے مجھ سے

شعر ہذا میں ایک مجازی پہلو بھی ہے جو محبوب کے لیے ہے اور ایک عمومی پہلو بھی ہے جو عوام الناس کے لیے ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کو ملا کر ایک بہت بڑا اخلاقی آدرش پیدا کیا گیا ہے۔ شعر ثانی میں شاعر نے اپنے انوکھے پن کے حوالے سے گفتگو کی ہے یعنی مجھے قدرت نے ایک جودتِ طبع اور انفرادیت عطا کی ہے۔ میں اپنی ذات میں ہی ایک پیکرِ صفات ہوں یعنی شاعر نے اپنے آپ کو باہمہ صفت موصوف قرار دیا ہے یعنی زندگی گزارنے کا میرا ایک خاص طرز ہے کہ اپنا دربار آپ ہوں اور خود ہی اپنی سرکار ہوں۔ عمومی جمہوری انداز کے برعکس شعر ہذا آمریت اور مطلق العنانیت کا مظہر ہے۔ اسے آپ ذاتی اختیارات کے حوالے سے ایک قدری فلسفہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ شعر ہذا میں جا گزیں احساس ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور سماج کی طرف سے ہونے والی عزت افزائی کا

منفی و منطقی اثر ہے۔شعر ثالث میں بھی خودثنائی اور خودستائی کے پہلو پائے جاتے ہیں کہ مجھے قدرت نے رفعتِ پرواز اور سرعتِ رفتار سے نوازا ہے۔اس کا ثبوت میں ابھی دینا چاہتا ہوں۔آپ خود بچشمِ سر دیکھیں گے کہ ذرا سی دیر میں افق پار پہنچ جاؤں گا اگر ہم یہ کہیں گے کہ شعر ہذا میں ایک بھر پور تعلیاتی تموج بھی پایا جاتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ جسے حسنِ مبالغہ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔علاوہ ازیں شعر ہذا فکرِ آخرت اور حبِ موت کی طرف بھی موئید ہے۔

غزل مابعد سات متضمن اشعار پر مشتمل ہے جسے ہم بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین کرتے ہیں کہ مشک آنست کہ خود بگوید نہ بگوید جوہری۔

زہد امروز میں وہ عالمِ تقویٰ بھی نہیں
توبہ توبہ کہ کوئی طالبِ طوبیٰ بھی نہیں
آج حق عاجز و مجبور نظر آتا ہے
حربِ داؤد نہیں قربتِ موسیٰ بھی نہیں
معجزہ دیکھنے کو آج ترستی ہے نظر
حسنِ یوسف بھی نہیں نفخۂ عیسیٰ بھی نہیں
جا نکلتے تھے کبھی جن کی طرف اہلِ حرم
اب تو آزاد رہا خطۂ اقصیٰ بھی نہیں
صبرِ ایوب کہاں وہ غمِ یعقوب کہاں
عزمِ احمدؐ بھی نہیں گریۂ یحییٰ بھی نہیں
عشق و اخلاص کہاں پہلے زمانے والا
رمِ مجنوں بھی نہیں محملِ لیلیٰ بھی نہیں
اب وہ افسانے کہاں مہر و مروت والے

شعرِ اختر بھی نہیں الفتِ سلمٰی بھی نہیں

(ص:37)

آ گے ایک اور غزل میں موضوع کی نسبت سے دو اشعار موجود ہیں جو کچھ یوں ہیں۔

ہم آپ کی نظروں میں بھی تنکے سے ہیں کم تر
کیا آپ بھلا فکرِ پرکاہ کریں گے
کرنے کے لئے کام اگر کچھ بھی نہیں ہے
پھر وضع وہ ہر شب نئی افواہ کریں گے

(ص:32)

شاعر محبوب سے اس کے رویہ ناقدری کا گلہ گزار ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہم آپ کی نگاہوں میں تنکے سے بھی کم حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر آپ سے کیسے توقع کی جائے کہ آپ ایک پرکاہ کو اہمیت دیں گے مراد یہ ہے کہ آپ کے مزاج کے خلاف بھلا کیسے توقع کی جاسکتی ہے۔شعر ہذا ایک رومانوی حوالہ بھی ہے اور ایک شخصی حوالہ بھی ہے۔ایک امکانی تخاطب شعر ہذا میں برسرِ اقتدار طبقے، اصحابِ ثروت یا عام اہلِ زمانہ سے بھی ہوسکتا ہے۔علی ہذا القیاس یہ ایک سماجی طبقاتی یا سیاسی حوالہ بھی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر ہذا فکری حوالے سے وسیع تر امکانات کا حامل ہے۔شعر ثانی میں یہ کہا گیا ہے کہ دنیا میں کوئی نہ کوئی کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔اگر اور کوئی کام نہ ہو تو افواہ سازی ہی سہی، یعنی نئی افواہیں وضع کرنا اور انہیں پھیلانا نکمے لوگوں کے ہاں کام کا درجہ رکھتا ہے۔مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہر مزاج کے لوگ پائے جاتے ہیں اور ہر کسی کی اپنی اپنی سوچ ہے۔ فارسی کی مشہور مثال ہے۔

؎ فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

غزل از اں بعد میں بھی اسی نوعیت کے دو اشعار قابلِ ذکر ہیں۔

آئندہ نہ ہم پیشگی آگاہ کریں گے
جو کچھ ہمیں کرنا ہوا ناگاہ کریں گے
کہتے ہوئے پائے گئے دو چار سیانے
ہم زندگی اب صورتِ روباہ کریں گے

(ص:40)

مطلع ندرتِ قافیہ کا مظہر ہے۔آگاہ و ناگاہ کمال صوتی موافقت رکھتے ہیں۔علاوہ ازیں غزل ہذا کی ردیف یعنی ''کریں گے'' فردائی امکانات کی حامل ہے۔قبل از وقت شور مچا جادوسروں کو پریشان کرنے کے مترادف ہے۔بیل ہمیشہ تب منڈھے چڑھتی ہے جب خاموشی ،سنجیدگی اور رازداری سے کام لیا جائے۔لہٰذا خاص مزاج کے لوگوں کے ڈھب کا یہ شعر ہے۔شعر ثانی چالاک مزاج لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے۔کچھ سیانے یہ کہہ گئے ہیں کہ سادہ مزاجی سے کام نہیں چلتا بلکہ کاربرداری کے لیے بسا اوقات لومڑی کی سی عیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے بعد والی غزل میں بھی زمانہ شناسی کے حوالے سے ایک شعر ملاحظہ کریں۔

بنیں گے نوعِ بشر درندے تو سخت برہم سماج ہوگا
رہے گی انسان میں لڑائی کی خو تو اک روز جنگ ہو گی

(ص:41)

شعر ہذا تہذیبِ خالص اور صلح صفائی کا ترجمان ہے یعنی اگر لوگوں میں درندگی پیدا ہوگی تو معاشرے کا نظام بھی ضرور درہم برہم ہوجائے گا اور اگر لوگوں میں بدخوئی اور سرکشی کا چلن فروغ پائے گا تو جنگ کے امکانات بھی ضرور پیدا ہوں گے۔

آگے ایک اور غزل میں موضوع کی نسبت سے چار اشعار پائے جاتے ہیں۔

ہم نے یونہی تو دل نہیں ہارا

کوئی دیکھا نہ آپ سے قابل
جنسِ الفت سے تھے وہ بے بہرہ
یوں تو بندے کئی ملے قابل
کیسا نااہل وہ ہوا ثابت
ہم سمجھتے رہے جسے قابل
ہم نے فاتحؔ یہ بھید پایا ہے
تھے جو قابل سدا رہے قابل

(ص:42-43)

شعراول میں محبوب کی تعریف کی جارہی ہے اور اپنے دل ہارنے کا جواز پیش کیا جارہا ہے کہ ہمارا محبوب سب سے قابل تھا، لہٰذا ہمارا دل جیتنے میں اس نے ذرا بھی دیر نہیں کی۔ دوسرے شعر میں لوگوں کے عمومی رجحان کی بات کی جارہی ہے کہ ہمیں بہت سے لائق و فائق لوگ ملے لیکن اکثریت کا حال تھا کہ وہ جنسِ محبت سے محروم تھے، گویا خاص لوگوں کے حصے میں محبت آتی ہے۔ بقول اقبال:

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

مزید برآں:

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

شعر ہذا میں گریز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ سخن ور ہر نوع کی گفتگو کرنے میں طاق ہے۔ تیسرے شعر کے مطابق لوگ جیسے دکھائی دیتے ہیں، دراصل وہ ویسے ہوتے نہیں ہیں۔ انسان کا وجدان اور اس کی نگاہ دھوکہ کھا سکتی ہے۔ جس

کے سبب دوہرے رویے وجود میں آتے ہیں۔ بقول کسے:

دیکھا تو سب ہی لعل و جواہر لگے مجھے
پرکھا جو دوستوں کو تو اکثر میں کچھ نہ تھا

چوتھا شعر جو دراصل غزل کا مقطع ہے، اس میں ایک پتے کی بات کی گئی ہے یعنی ہم پر یہ راز منکشف ہوا ہے کہ جو لوگ اہل اور قابل تھے، ہمیشہ وہ اہل اور قابل رہے۔ چار اشعار میں زمانہ شناسی کے حوالے سے مختلف رویے پائے جاتے ہیں اور متنوع اسباق مضمر ہیں۔ محولہ بالا اشعار بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔

آمدہ غزل میں موضوع کی مناسبت سے ایک شعر جاگزیں ہے۔

کر تماشا شوق سے امواجِ سرخ و گرم کا
میرے قاتل میرے زخموں سے لہو جاری رہے

(ص:46)

شعر ہذا میں عاشق محبوب کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے کہ میرے زخموں سے جو گرم و سرخ لہو جاری ہے، وہ جاری رہنا چاہیے تا کہ محبوبِ دل نواز تا دیر محوِ نظارہ رہے۔ یہ گھر جلا کر تماشا دکھانے والی بات ہے۔ جس میں اذیت پسندی کا ایک پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ شعر ہذا بحر رمل مثمن محذوف میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔ اگلی غزل مذکورہ موضوع کے حوالے سے پانچ اشعار کی حامل ہے:

پھنک رہا تھا بدن میرا سوزِ ہجراں میں
سو چار دانگ زمانے میں دود میرا تھا
جو بج رہے تھے مزامیر ہو گئے خاموش
کہ ان کی بزمِ طرب میں ورود میرا تھا

مِرا تھا بیٹھنا اُٹھنا تِرے حوالے سے
نہ اس میں میرا زیاں تھا نہ سود میرا تھا
وہ بے وفا تھا تو رہنا تھا بے وفا اس نے
بدیر ہونا تھا میرا نہ زود میرا تھا
مجھے جہاں میں تھیں ہر دلعزیزیاں حاصل
لبِ زمانہ پہ فاتحؔ سرود میرا تھا

(ص:47-48)

غزل ہذا کے قوافی خاصے دشوار اور مشکل الاستعمال ہیں مگر ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ نے انہیں جس مہارت سے برتا ہے وہ یقیناً انہی کا حصہ ہے۔ ایسا عمدہ لسانی امتزاج شاذ و نادر ہی کہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلا شعر صنعتِ مبالغہ کا حامل ہے یعنی میرا وجود سوزِ ہجراں میں ایسا جل رہا ہے کہ ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل رہا ہے جو میری سوزِ جاں کا حوالہ تھا۔ یہ شعر کربِ ذات کا مظہر ہے۔ دوسرے شعر میں بھی خود ثنائی کا عالم پایا جاتا ہے یعنی میری ذات میں وہ جواہر ہیں کہ میں جونہی ان کی انجمن میں پہنچا، بجتے ہوئے ساز خاموش ہو گئے ہیں۔ یہ دراصل جلالتِ شان اور رعبِ ذات کا حوالہ ہے۔ کسی حد تک اس میں شومئ قسمت کا حوالہ بھی پایا جاتا ہے۔ فاتحؔ جی کا ہی ایک اور شعر اس سے قدرے مشابہت رکھتا ہے۔

وہ پیکر جونہی بولا ساز دھیمے پڑ گئے سارے
نہ وہ سُر تال باقی تھا نہ زیر و بم نظر آیا

تیسرے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم تو دوستی نبھا رہے تھے ورنہ ان کی محفل میں اٹھنے بیٹھنے سے ہمارا کوئی نفع و نقصان وابستہ نہیں تھا۔ چوتھے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ لوگوں کے مزاج بدلا نہیں کرتے، میں نے ہی محبوب سے حسنِ ظن رکھا ہوا تھا۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ وہ نہ آج میرا ہوانے والا تھا اور نہ کل ہوا تھا۔ پانچویں شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ میرے نغمات ہی

میری مقبولیت و ہر دلعزیزی کا باعث بنے۔

نظم حسن و عشق میں دنیا شناسی کے بہت سے حوالے پائے جاتے ہیں۔ یہ متوسط بحر کی ایک ایسی نظم ہے جس میں روانی کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اس نظم میں حسن و شوق دونوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور دونوں کی شدید خطرناکی کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ان کی بدولت بندے مقامِ خدا پا لیتے ہیں۔ بادشاہ گدا بن جاتے ہیں۔ گلشن آتش کدے بن جاتے ہیں۔ صرصر رشکِ صبا ٹھہرتی ہے۔ زہر کا پیالہ جامِ شفا ثابت ہوتا ہے۔ غمِ جدائی میں نین بادل بن جاتے ہیں۔ دماغوں کا توازن بدل جاتا ہے۔ کمزور نڈر ہو جاتے ہیں۔ سیانے لوگ دیوانے بن جاتے ہیں۔ بھیگی ہوئی شامیں سحر ہو جاتی ہیں۔ دل و جاں غارت ہو جاتے ہیں۔ صحرا جنت نشاں بن جاتے ہیں۔ حسن و عشق کے باعث جذبات کا خون ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے سحر و فسوں کی نوبت آجاتی ہے۔ سکون و قرار لٹ جاتا ہے۔ جوش و جنوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حالات زبوں ہو جاتے ہیں۔ دنیائے دوں فتح ہو جاتی ہے۔ حالِ دروں دیدنی ہوتا ہے۔ کبھی ان کی بدولت سر جھک جاتے ہیں اور کبھی فراز ہو جاتے ہیں۔ کیفیتِ دل سخن کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں ان کے باعث رونما ہوتی ہیں۔ نظم ملاحظہ کریں۔

اے حُسن تیری خیر ہو اے عشق تیری خیر
دیکھا ہے کہ بندوں کو خدا تو نے بنایا
سنتے ہیں کہ شاہوں کو گدا تو نے بنایا
مہکے ہوئے باغوں کو چتا تو نے بنایا
صرصر کو بھی مانندِ صبا تو نے بنایا
زہراب کو اکسیرِ دوا تو نے بنایا
آنکھوں کو جدائی میں گھٹا تو نے بنایا

---

وہ خود کو گنواتا ہے جو کرتا ہے تِری سیر
اے حُسن تِری خیر ہو اے عشق تِری خیر
اذہان کو بھی زیر و زبر تو نے کیا ہے
کمزوروں کو بھی سینہ سپر تو نے کیا ہے
داناؤں کی عقلوں پہ اثر تو نے کیا ہے
بھیگی ہوئی شاموں کو سحر تو نے کیا ہے
وہ دل نہ رہا جس میں بھی گھر تو نے کیا ہے
صحراؤں کو فردوسِ نظر تو نے کیا ہے
آفاق پہ فیضانِ نظر تو نے کیا ہے
وہ خود کو گنواتا ہے جو کرتا ہے تیری سیر
اے حُسن تِری خیر ہو اے عشق تِری خیر

---

جذبات کا بہتا رہا خوں تیری بدولت
ایجاد ہوئے سحر و فسوں تیری بدولت
لٹتا رہا جو دل کا سکوں تیری بدولت
بڑھتا ہی گیا جوش و جنوں تیری بدولت
ہوتے گئے حالات زبوں تیری بدولت
تسخیر ہوا عالمِ دوں تیری بدولت
سر ٹھہرے ہیں مغرور و نگوں تیری بدولت
غزلوں میں ڈھلا حالِ دروں تیری بدولت

تبدیلیاں آتی رہیں یوں تیری بدولت

---

وہ خود کو گنواتا ہے جو کرتا ہے تِری سیر
اے حُسن تِری خیر ہو اے عشق تِری خیر

(ص:49-50)

گویا یہ نظم حسن و جمال اور خلوص و عشق کی پوری پوری عکاس ہے کہ ان عناصر کے باعث دنیا میں کیا کچھ رونما ہوتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تیری خیر کہہ کر دونوں کو مخاطب کیا گیا اور خراجِ تحسین پیش کیا ہے مگر کہیں کہیں گریز کے پہلو بھی عیاں ہیں۔ جو اس کی غیر جانبداری کا مظہر ہیں۔ نظم ہذا نے کلاسیکی نظم کی یاد کو پھر سے تازہ کر دیا ہے۔

نظم کے بعد پوری ایک غزل زمانہ شناسی کی آئینہ دار ہے جس میں موضوعِ مذکور کے حوالے سے متنوع رویے پائے جاتے ہیں۔ پڑھیے اور سر دھنیے۔

وہ ایک لڑکی ڈری ڈری سی
تھیں جس کی باتیں کھری کھری سی
ہوئی ہے وہ دل پہ حملہ آور
لئے ادائیں فری فری سی
لگے نہ الزام کوئی اس پر
ہے تہمتوں سے بری بری سی
اگرچہ حوا کی ہے وہ بیٹی
دکھائی دی ہے پری پری سی
اگرچہ وہ پر خیال بھی ہیں
ہیں اس کی آنکھیں بھری بھری سی

ہیں دل کش و دل نواز کتنی
یہ اس کی بانہیں بھری بھری سی
یہ ساز کیسا بجا رہی ہیں
جو چوڑیاں ہیں ہری ہری سی
وہ ہنس کے بولی کہ بول فاتحؔ
ہے تیری لَے کیوں مری مری سی

(ص:51)

اسی طرح ایک اور پوری غزل زمانہ شناسی کی ترجمان ہے جسے بدونِ تبصرہ سپردِ قارئین کیا جاتا ہے۔

ہوتا ہے مِرا یار مِرے سنگ مِرے ہاں
رہتی ہے عجب ساعتِ صد رنگ مِرے ہاں
اک یہ نہیں خوشیاں ہی یہاں زار و زبوں ہیں
ہے قافیہ آلام کا بھی تنگ مِرے ہاں
اک سمت محبت ہے تو اک سمت اَنا ہے
جذبات میں رہتی ہے بپا جنگ مِرے ہاں
ہوتی ہے مِرے ذوقِ سماعت پہ نوازش
بربط ہے مِرے پاس نہ ہے چنگ مِرے ہاں
اک موجِ تبسم ہے کہ تھمتی ہی نہیں ہے
یلغارِ حوادث ہے کہ ہے دنگ مِرے ہاں
آرام و سکوں سے مجھے رہنے نہیں دیتی
بہتی ہے تضادات کی جو گنگ مِرے ہاں

کرتا ہے عطا ولولۂ تازہ دلوں کو
مواج ہے وہ جذبہ و آہنگ مِرے ہاں
فاتح مِری ہستی کوئی معمولی نہیں ہے
تقسیم ہوئے افسر و اورنگ مِرے ہاں

(ص52)

غزل مابعد چار متضمن اشعار پر مشتمل ہے جو یہ ہیں۔

یہ سوچ کے آیا ہے یہ مجذوب تِرے پاس
ہے دل کی دوا اے مِرے محبوب تِرے پاس
یہ بات کہاں اہلِ جہاں کو ہے گوارا
آ کے رہے کچھ دن تِرا منسوب تِرے پاس
لے اس سے مِرے جذبۂ خالص کی گواہی
موجود تو ہو گا مِرا مکتوب ترے پاس
ہر آن اسے تیری طلب ہے تِری دھن ہے
رہ جائے ہمارا دلِ مندوب تِرے پاس

(ص:53)

جملہ اشعار میں ردیف ''ترے پاس'' رومانوی تموج اور محبوب سے تخاطب کی ترجمان ہے۔ پہلے شعر میں شاعر خود کو ایک درویش ظاہر کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ درویش صرف یہی سوچ کر تری خدمت میں حاضر ہوا ہے کہ تیرے ہاں درد ِدل کی دوا دستیاب ہے اور اسے اس کی شدید ضرورت ہے۔ دوسرے شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا والے دو دل والوں کی قربت گوارا کرتے ہیں۔ یہاں منسوب سے مراد نسبتِ عشق رکھنے والا ہے۔ تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اے میرے محبوب اگر تجھے میری محبت پر شک ہے تو اس کی

صداقت کی گواہی میرا وہ خط دے گا جسے تو نے اپنے پاس محفوظ کر رکھا ہے۔ چوتھے شعر میں سخنور اپنے دل کی تعریف کر رہا ہے اور گویا ہے کہ یہ قیمتی اور بڑھیا دل جسے ہر وقت تیری طلب اور ہر دم تیری دھن ہے، تیرے پاس ہی رہنا چاہیے۔ تجھ سے دور ہونے کے باعث یہ خطرات میں گھرا رہے گا اور ضائع بھی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح اس سے آگے والی غزل میں بھی موضوع سے متناسب چار اشعار جاگزیں ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

محبت ہے برکھا پھواروں کو تجھ سے
تو جس روز آئے برستی گھٹا ہے
ترِی میری نسبت ازل سے ہے جاناں
تو کب سے مِری چاہتوں میں بسا ہے؟
دغا دینے والا نہایت برا ہے
کسی طور قابو میں آتا نہیں تو
پھسلتا ہی جاتا ہے چکنا گھڑا ہے
ملاقات ہم نے بھی فاتح سے کی ہے
یہ محسن ہے مخلص ہے انساں کھرا ہے

(ص:54)

شعر اول میں محبوب سے تخاطب ہے کہ تجھ سے بہاروں اور پھواروں کو محبت ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تو جب بھی آتا ہے ابر چھا جاتے ہیں۔ موسم بہار آفریں ہو جاتا ہے اور بوندا باندی ہونے لگتی ہے۔ گویا یہ تیری کرامت ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب کو جتلا یا جا رہا ہے کہ تیری میری نسبت یا تعلق بہت پرانا ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ تیری چاہت کب سے میرے دل میں بسی ہوئی ہے۔ گویا شعر ہذا میں ازل کا حوالہ دے کر صنعتِ مبالغہ کا استخدام

کیا گیا ہے۔تیسرے شعر محبوب سے گلہ گزاری ہے کہ تو کسی طرح ہمارے قابو میں نہیں آتا۔ بالکل چکنے گھڑے کی طرح ہے جو بڑی آسانی سے پھسل جاتا ہے۔ یہاں چکنا گھڑا کا استعارہ خود میں ندرت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔مزید برآں یہ اردو میں بطور محاورہ مستعمل ہے۔غزل کا مقطع عرفانِ ذات کا مظہر ہے اور ایک بھرپور شاعرانہ تعلّی بھی ہے۔جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت فاتح سے ہماری ملاقات بھی رہی ہے جس میں کئی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ بطورِ خاص ایک محسن شخص ہے، پیکرِ اخلاص ہے اور سچا کھرا انسان ہے۔محولہ بالا اشعار بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان فعولن فعولن فعولن فعولن ہیں۔

غزل مابعد میں زمانہ شناسی کی نسبت سے ایک استشہادی حوالہ موجود ہے جو کچھ یوں ہے:

کتاب و سنت سے دور ہے جو
امیر کیا ہے ، امام کیا ہے؟

(ص:55)

تمسک بالکتاب وتمسک بالحدیث ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔امیر وامام کا مرتبہ تو امت میں خاصا بلند ہوتا ہے۔اگر وہ بھی اس وصف سے عاری ہو تو اس قابل ہی نہیں ہے کہ اسے امارت یا امامت کا منصب دیا جائے۔ یہ شعر ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی دینی محبت و غیرت کا مظہر ہے۔مزید برآں اسے آپ ایک بھرپور تنقیدی رویہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسے ایک معیار یا کسوٹی امامت وامارت کے لیے سمجھا جا سکتا ہے۔شعر ہذا ایک مربع وزن میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعلاتن مفاعلاتن ہے۔ بحر ہذا کا شمار بحورِ مستحدثہ میں ہوتا ہے جو ایک رقصاں بحر ہے اور آہنگ وغنائیت سے معمور ہے۔

آمدہ غزل میں زمانہ شناسی کے حوالے سے پانچ اشعار لائقِ التفات ہیں۔

نظر میں الجھنیں بولیں

سخن میں حسرتیں بولیں
پڑے ہیں منتظر کب سے؟
کبھی تو آہٹیں بولیں
ترستی ہے سماعت بھی
کسی کی دستکیں بولیں
رگوں میں خوں دُہائی دے
جدائی میں رگیں بولیں
زباں خاموش رہتی ہے
ہماری دھڑکنیں بولیں

(ص:56-57)

شاعر حواسِ خمسہ سے کارِ تکلم لے رہا ہے۔ ہماری نگاہوں میں الجھنیں بولتی ہیں اور صاف پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی بڑے الجھاؤ میں مبتلا ہیں۔ ہمارے کلام میں حسرتیں محوِ گفتگو محسوس ہوتی ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم شدید حسرت زدہ ہیں۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ انتظارِ یار کا یہ عالم ہے کہ کان لگا رکھے ہیں کہ شاید کہیں محبوب کی آہٹ سنائی دے اور دل باغ باغ ہو جائے۔ تیسرے شعر میں یہ اظہار کیا جا رہا ہے کہ ہماری سماعتیں ایک عرصہ سے ترس گئی ہیں، کسی نے دستک نہیں دی۔ کاش اب محبوب کی دستک ہمارے در کو شرف بخشے اور ہماری سماعتوں کو سرور حاصل ہو۔ چوتھے شعر میں بے قراری کا یہ عالم ہے کہ نبضوں کا ارتعاش بڑھ چکا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خون رگوں میں دہائی دے رہا ہے اور غمِ ہجر میں رگیں پھٹنے کے قریب ہیں۔ گویا ان اشعار میں ان اجزاء کو محوِ تکلم ظاہر کیا جا رہا ہے جو عموماً غیر متکلم ہوا کرتے ہیں۔ امر ہذا کو آپ صنعتِ مبالغہ کی ایک نادر صورت بھی قرار دے سکتے ہیں یا اسے آپ شاعر کے حسنِ بیاں کا ترفع گردان سکتے ہیں۔ پانچویں شعر میں یہ اظہار کیا

گیا ہے کہ قدرت نے زبان تو لنے کے لیے دی ہے مگر ہم نے اس پر مہرِ سکوت ثبت کر رکھی ہے اور ہم دھڑکنوں سے کارِ گویائی لے رہے ہیں۔ یہ اشعار بحر ہزج کے مربع وزن میں کہے گئے ہیں جسے مربع سالم بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

آمدہ غزل میں موضوع کی مناسبت سے چھ اشعار پائے گئے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

وہ کل کا حصہ تو کٹ گیا ہے
مگر گزارو گے آج کیسے؟
غموں کی جاری ہے ژالہ باری
بچے گا دل کا زجاج کیسے؟
شعورِ الفت جنھیں نہیں ہے
وہ دل پہ کرتے ہیں راج کیسے؟
کیا ہے بے کار عاشقی نے
کریں گے اب کام کاج کیسے؟
بڑا بھروسہ تھا جس پہ تم کو
کیا ہے اس نے مساج کیسے؟
تمھارے ہوتے ہوئے بھی فاتح
ستم نے پایا رواج کیسے؟

(ص: 58-59)

شعر اول میں یہ کہا گیا ہے کہ وقت دھیرے دھیرے گزرتا جا رہا ہے۔ آج اور کل کی صورت کبھی آسانی سے کبھی مشکل سے کل کا حصہ جیسے تیسے کر کے کٹ گیا۔ سوچنے والی بات

یہ ہے کہ آج کیسے گزارا جائے یا بصورتِ ہجراں تم آج کا دن کیسے گزارو گے۔ شعر ہذا میں امکانی طور پر دوش کی نسبت امروز کو سنگینی کے اعتبار سے بالادستی حاصل ہے اور اس کے بارے میں سوچ بچار بہت ضروری ہے۔ شعر دوم میں کہا گیا ہے کہ غم آئے دن بڑھتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے ژالہ باری کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دل جو شیشے کی طرح نرم و ملائم ہے، معرضِ خطر میں پڑ گیا ہے اور امرِ پریشانی یہ ہے کہ ان حالات میں یہ سلامت کیسے بچے گا؟ شعر سوم میں شعورِ محبت کی نسبت سے بات کی گئی ہے کہ ہر کام کے لیے اس کا بنیادی شعور ضروری ہے۔ پھر اس کی روشنی بیل منڈھے چڑھتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو شعورِ عشق سے عاری ہیں، دل پر کیسے راج کر رہے ہیں؟ شعر چہارم میں کہا گیا ہے کہ عشق و محبت نے ہمیں عضوِ معطل بنا کے رکھ دیا ہے اب ہم سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ حالانکہ زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اب ہم اس فکر میں غلطاں ہیں کہ ان حالات میں ہم کام کاج کس طرح کریں گے۔ بقول میرؔ:

ہو گا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

یعنی آرام طلبی میں انسان کام تو کیا، محبت بھی ڈھب سے نہیں کر سکتا۔ بقول غالبؔ:

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

شعر پنجم میں سخن ور گویا ہے کہ جس پر اعتبار تھا، اس نے کیسے تمہیں رگیدا ہے۔ شعر ہذا میں لفظ ''مساج'' مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ویسے تو مساج کے معنی مالش کے ہوتے ہیں، لیکن یہاں پٹائی اور ٹھکائی کے معنی میں لایا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہاں مجازی استعمال زیادہ پرتاثیر ہو گیا ہے۔ شعر ششم جو غزل کا مقطع ہے، اس میں شاعر خود کو ملامت کر رہا ہے کہ تجھ سے تو بڑی خیر کی امیدیں تھیں، مگر یہ کیا کہ تیرے ہوتے ہوئے بھی یہ ظلم و ستم

عام ہورہا ہے اور تو ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مراد یہ ہے کہ انسان کو ظلم وزیادتی روکنے کی ٹھوس کوشش کرنی چاہیے۔ اگر وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے تو ظلم وتعدی کے آگے بند نہ باندھے تو گونگا شیطان شمار ہوگا۔ اگر دیکھا جائے تو شعر ہذا ذاتی اعتبار سے تنقیدی رویے کا حامل ہے۔ محولہ بالا اشعار مربع وزن میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن مفاعلاتن مفاعلاتن ہے۔ اشعارِ غزل کی ردیف ''کیسے'' استفہامیہ رنگ کی حامل ہے جو بھرپور دعوتِ غور وفکر خود میں لیے ہوئے ہے اور اس کے قوافی آج، راج، مساج اور رواج نادر و مشکل قوافی میں شمار ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ایک دوغزلہ ہے۔ دوسرے حصے میں بھی اسی زمین میں تین اشعار موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ہو پوری ہر احتیاج کیسے؟
بہم ہو مہنگا اناج کیسے؟
مِرے مرض سے جو بے خبر ہیں
کریں گے میرا علاج کیسے؟
ہیں روکھی پھیکی تمھاری باتیں
بھلا نہ ہو اختلاج کیسے؟

(ص:60)

غزل کے مطلع میں مشکلاتِ زمانہ کو بنیادی طور پر زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ دنیا میں ضروریات آئے دن فزوں سے فزوں تر ہوتی جارہی ہیں اور گرانی ہے کہ بڑھتی جارہی ہے۔ یوں تو ہر احتیاج ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے مگر اناج اس قدر مہنگا ہوگیا ہے جو عام آدمی کی پہنچ سے بہت دور چلا گیا ہے کہ اس کی بہم رسانی بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ دوسرے شعر میں چارہ گر کے تغافل کی بات ہے کہ انہیں تو میرے روگ سے آگاہی بھی نہیں پھر وہ میری تکلیف کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔ تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ تمہاری

گفتگو آج کل ایسی روکھی پھیکی اور غیر دلچسپ ہوگئی ہے کہ جی متلانے لگتا ہے۔لہٰذا نرم ملائم اور دل پذیر گفتگو کرنی چاہیے۔واقعہ یہ ہے کہ زورِ بیاں اور شدتِ احساس کے حوالے سے ان اشعار کی ردیف بہت بلیغ ہے۔

آگے آنے والی غزل میں ایک شعر اسی ضمن میں دستیاب ہے۔

ہو تم خود قیس ، خود لیلیٰ ہو پیارے
کسے اے حسن آرا ڈھونڈتے ہو؟

(ص:61)

یہ شعر عجیب نوعیت کا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ محب ومحبوب کی تمام تر خصوصیات خود تمہاری ذات میں موجود ہیں۔پھر تم کس کی تلاش میں سرگرداں ہو۔یاد رکھو کہ تم خود ہی قیس ہو اور خود ہی لیلیٰ پھر کیا پریشانی لاحق ہے؟ جیسا کہ پنجابی کا مشہور مصرع ہے۔

؎ رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی

بقول اقبال:

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
قیس تو لیلیٰ بھی تو محمل بھی تو صحرا بھی تو

یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیرِ نظر شعر کے مصرع اولیٰ میں خودی اور خودداری کی جھلک پائی جاتی ہے۔یعنی انسان اگر سوچے تو وہ خود انحصاری کی حد کو پہنچا ہوا ہے۔شعر ہذا بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔

ازابعد ایک غیر مردف غزل موجود ہے جو فنی لحاظ سے مہارت کی آئینہ دار ہے۔لطف کی بات یہ ہے کہ ردیف سے بے نیاز ہونے کے باوجود کہیں بھی ردیف کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔غزل ہذا میں چار اشعار زمانہ شناسی کی نسبت سے پائے جاتے ہیں۔

ایمان ہے اپنا ، ہے ترے حسن کا پرتو

وہ نورِ قمر ہو کہ وہ خورشید کی ہو ضو
ایقان و توکل مِری فطرت کا ہے خاصہ
واحد مِرا معبود ہے تیرے ہیں کئی سو
کیا تجھ سے تقابل مِرا اے جانِ تمنا؟
تو بدرِ منور ہے تو میں ایک مہِ نو
فاتحؔ مجھے آتی ہے نظر تیری ہی تنویر
دے اٹھتا ہے دل فرطِ محبت میں جہاں لو

(ص:62)

شعر اول جو غزل کا مطلع بھی ہے، حسنِ حقیقی کی طرف اشارہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ سورج کی روشنی ہو یا چاند کا نور ہو، سب تیرے حسن کا ہی عکس ہے۔ یعنی اللہ سے محبت کرنے والوں کو کہیں سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے حسن کے جلوے ہر آن ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ شعر ثانی میں سخنور ذاتی ایمان و یقین کی نسبت سے مدمقابل سے مخاطب ہے کہ ایک ہی ذاتِ عالی پر مرا یقین ہے۔ میں اس پر بھروسہ رکھتا ہوں مگر تیرے کئی سو معبود ہیں۔ شرک تجھے ایک دن لے ڈوبے گا۔ شعر ثالث میں شاعر محبوبِ مجازی سے مخاطب ہے کہ میرا حسن و جمال تیری صباحت کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟ میں نیا طلوع ہونے والا چاند ہوں تو چودھویں کا چاند ہے جو دل و نظر میں سما جاتا ہے۔ چوتھا شعر جو دراصل غزل کا مقطع بھی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ اے میرے محبوب مجھے اس میں بھی تیری روش نظر آتی ہے۔ جب میرا دل تیری محبت میں لو دے اٹھتا ہے۔ ان چاروں اشعار میں نقطۂ مشترک حسن، نور، تنویر، لو، پرتو، چاند، سورج، ضو، ایمان، یقین اور توکل جیسے خوبصورت الفاظ استعمال ہوئے ہیں جنہوں نے غزل کو لسانی، فکری اور صوری تقدس و ترفع عطا کیا ہے۔ مزید برآں غزل کا غیر مردف ہونا بھی ایک بھرپور فنی تجربہ ہے۔

اس کے بعد والی غزل میں زمانہ شناسی کے ضمن میں چار اشعار موجود ہیں، ملاحظہ کیجئے۔

سوختہ قسمت ہے کتنا کس قدر کنجوس ہے؟
وہ رقیبِ روسیہ گویا سیاہی چوس ہے
اس کی باتوں پر ہے شیطانی سیاست کا اثر
جیسے شاطر ہے بلا کا وہ مکینِ روس ہے
یہ تناقص آ گیا ہے کیسے تیری ذات میں؟
جو عمل تیرا ہے تیرے قول کے معکوس ہے
اے خدا! یہ لا پھنسایا ہے مجھے کس شہر میں؟
ہر بشر لگتا ہے جیسے کوئی جالینوس ہے

(ص:63)

شعر اول میں رقیب کا خاکہ اڑایا گیا ہے کہ اس میں دیگر عیوب کے علاوہ ایک خامی یہ بھی ہے کہ وہ پرلے درجے کا بخیل ہے۔ جیسے سیاہی چوس ہوتے ہیں، ورق پر رکھو تو روشنائی جذب کر لیتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا کالے منہ والا رقیب بھی کافی کنجوس واقع ہوا ہے۔ شعر ہذا میں ایک استعاراتی رنگ پایا جاتا ہے۔ دوسرے شعر میں غنیم پر یوں پھبتی کسی گئی ہے کہ اس پر طبع شیطانی کا بڑا اثر ہے۔ وہ بلا کا چلاباز اور شاطر ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ روسی باشندہ ہے کیونکہ اہلِ روس غضب کے شاطر ہوتے ہیں اور شطرنج میں ان کا مقابلہ خاصا دشوار ہوتا ہے۔ وہ ایسی ایسی چالیں چل جاتے ہیں جن کا توڑ مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں تشبیہاتی رنگ پایا جاتا ہے۔ تیسرے شعر میں شاعر اپنے دوست سے بصد تعجب دریافت کر رہا ہے کہ تیری ذات میں اتنی مغائرت کیسے پیدا ہو گئی ہے کہ تیرے قول و فعل میں زبردست فرق پیدا ہو گیا ہے۔ ہم یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعر ہذا میں

ایک تنقیدی رویہ پایا جاتا ہے۔ ہمارا مذہب اسلام بھی قول وفعل کے فرق کو ناپسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! ایسی بات کرتے کیوں ہو جس پر عمل نہیں کر سکتے۔ گویا آدمی کو قول کا پابند ہونا چاہیے اور اس کے قول وفعل میں مطابقت کی فضا ناگزیر ہے۔ چوتھا شعر شاعر کی اس کیفیت کو بیان کرتا ہے کہ وہ حیران وششدر ہے کہ یہاں کا ہر انسان حکیم جالینوس کی طرح فلسفی نظر آتا ہے اور اپنی باتوں میں پھنسالیتا ہے۔ اس شعر میں دنیا سے بیزاری کی فضا بھی پائی جاتی ہے اور اللہ کے حضور شکوہ گزاری کا انداز بھی ہے کہ اس نے مجھے کہاں لا پھنسایا ہے۔ گویا ان سب اشعار میں اہلِ زمانہ سے کوئی نہ کوئی گلہ اور ان کی ادا سے ناپسندیدگی کا اظہار واشگاف انداز میں موجود ہے۔ مذکورہ اشعار بحر رمل مثمن محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان اشعار میں نادر قوافی مستعمل ہیں جو شاذ ہی کہیں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یقیناً یہ شاعر کی فنی چابکدستی کا کرشمہ ہے اور یہ بات قدرتِ بیاں کے دائرے میں آتی ہے۔

متذکرہ غزل کے بعد والی غزل میں موضوعاتی حوالے سے ایک شعر کارفرما ہے۔

تھے تم اہلِ جنوں ، قابو میں میرے کیسے آ جاتے
بپا دیوانگی سے اک نہ اک طوفان کرنا تھا

(ص:66)

زیرِ نظر شعر ایک عجیب کیفیت خود میں لیے ہوئے ہے۔ مخاطب سے کہا جا رہا ہے کہ تم تو جنوں کیش تھے، کیسے ممکن تھا کہ تم میرے قابو میں آ جاتے اور اگر میں سعیِ بسیار بھی کرتا تو خطرہ تھا کہ تم اپنی دیوانگی سے کوئی کہرام برپا کر دیتے۔ شعر ہذا بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور شعر قابلِ توجہ ہے۔

عجب ستم ہے ، عجیب غم ہے اسی تصور میں آنکھ نم ہے
خلوص دم توڑنے لگا ہے وفا پریشان ہو چکی ہے

(ص:68)

شاعر سماجی اقدار کے مٹنے کا گلہ گزار ہے اور اسے ستم قرار دیتا ہے۔ اسی غم میں اس کی آنکھیں نم آلود ہیں کہ عہدِ حاضر میں وفا و خلوص ناپید ہو رہا ہے۔ اسے ہم زمانہ شناسی کے ساتھ ساتھ ایک بھرپور عصری رویہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ شعر ہذا ایک مثمن وزن میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ اس بحر کا شمار بحورِ مستحدثہ میں ہوتا ہے جن سے مراد ایسی بحور ہیں جن کے اوزان دیگر بحور سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس بحر کا وزن بھی بحر رجز اور بحر کامل سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم تاحال اس بحر کو کوئی باضابطہ نام نہیں دیا جا سکا۔ بعضوں نے تو اسے بحرِ بلااسمی لکھا ہے۔
اس سے اگلی غزل میں تین اشعار پائے جاتے ہیں جو موضوعِ مذکور سے متعلق ہیں۔

اُنھیں چاہا اُن پر فدا ہو گئے ہیں
وہ باوصف اِس کے خفا ہو گئے ہیں
اُنھیں کتنا احساس ہے اس خطا کا
کہ اُن کے نشانے خطا ہو گئے ہیں
وہ یہ سن کے ناراض ہم پر ہیں فاتح
کہ ہم اہلِ دانش ذرا ہو گئے ہیں

(ص:69)

شعر اول میں شاعر اپنے والہانہ پن اور محبوب کی خفگی کی نسبت سے بیان کر رہا ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم زمانے سے مخلصانہ برتاؤ کرتے ہیں مگر وہ ہے کہ اس کا رویہ قابلِ افسوس ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب کا احساسِ زیاں اور خیالِ رائیگانی اس وجہ سے ہے کہ

وہ اپنے رسیا کو اچھی طرح ستا نہیں سکا۔ تیسرے شعر میں ایک عجیب عصری رویے پر طنز کیا گیا ہے کہ ہم نے علم و دانش میں دستگاہ کیوں حاصل کر لی، یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان اشعار کا محور عمومی رومانوی اور عصری رویے ہیں۔ مذکورہ اشعار بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن فعولن فعولن فعولن فعولن ہے۔

اس سے آگے والی غزل کے پانچ اشعار اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں زمانہ شناسی سے عبارت کیا جا سکتا ہے۔

تاروں نے ہنسی تیری جو اے ماہ اڑائی
لوگوں نے بھی کیا کیا نہیں افواہ اڑائی
بٹوا مرا جب ہاتھ لگا اس کے ہوا یوں
اس شوخ نے ساری مری تنخواہ اڑائی
پائی نہ مگر گرد کسی اہلِ جنوں کی
گھوڑوں نے بہت گرد سرِ راہ اڑائی
اس شخص نے، سمجھا جسے میں لائقِ تکریم
توقیر مری مثلِ پرِ کاہ اڑائی
فاتح مجھے اپنوں سے نہ غیروں سے گلہ ہے
دنیا نے کہانی مری ہر گاہ اڑائی

(ص:70)

شعر اول میں شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ تیری ادائیں دیکھ کر جب ستارے ہنس پڑے تو لوگ بھی طرح طرح کی افواہیں اڑانے لگے۔ جس کی سمجھ میں جو بات آئی، ویسی ہی توجیہہ کرنے لگا۔ دراصل یہ شعر مظاہرِ فطرت کی شہادت کے تناظر میں سماجی رویوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ دوسرے شعر میں ایسا لگتا ہے کہ شاعر کا روئے سخن اپنی اہلیہ کی طرف ہے

کہ جب میرا بٹوا اس کے ہاتھ لگ گیا تو اس نے مزے سے میری تنخواہ کے پیسے خرچ کیے اور اپنی ترجیحات پر رقم اڑائی۔ اگرچہ یہ شعر بظاہر ایک خاتونِ خانہ کے حوالے سے مگر یہ بناتِ حوا عموماً اور خصوصاً بیگمات کا حوالہ بھی ہے۔ تیسرے شعر میں تقابل ہے۔ اہلِ جنوں اور گھوڑوں کی سرعتِ رفتار کے درمیان اگرچہ گھوڑے خوب دوڑتے ہیں مگر وہ اہلِ جنوں کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔ شعر ہذا میں صنعتِ مبالغہ کا استعمال ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ایک بے جگری کی کیفیت ہے جو اہلِ جنوں اور گھوڑوں کے مابین مشترک ہے جس سے حسنِ بیاں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ چوتھے شعر میں اپنے محبوب کے رویے اور اپنے رویے کا تقابلی جائزہ لیا جا رہا ہے کہ میں تو اسے لائقِ تکریم سمجھتا تھا، اس کی عزت افزائی کرتا رہا مگر اس کا یہ حال ہے کہ اس نے تنکے کی طرح میری عزت سے کھلواڑ کیا۔ شعر ہذا کے مصرع ثانی میں ایک خوبصورت تشبیہاتی نظام پایا جاتا ہے اور مصرع اول و دوم میں تکریم و توقیر جیسے مترادفات استعمال ہوئے ہیں۔ پانچواں شعر جو غزل کا مقطع بھی ہے، شاعر کمال اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اگرچہ اپنے اور بیگانے میری شہرت کو نقصان پہنچاتے رہے جس سے میری دل آزاری ہوتی رہی لیکن مجھے کسی سے بھی شکوہ نہیں، نہ اپنے سے نہ بیگانوں سے، کیونکہ میرے نزدیک شکوہ کرنا ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ ہر چند کہ جوازِ شکوہ موجود ہے مگر شاعر شکوے سے گریزاں ہے اور یہی اس کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ بقول کسے:

نارسائی سے دم رکے تو رُکے
میں کسی کو برا نہیں کہتا

اسی طرح اگلی غزل میں چار اشعار زمانہ شناسی کی نسبت سے پائے جاتے ہیں۔

تم سے ڈھکی چھپی تو اپنی وفا نہیں ہے
اپنی ہے جاں نثاری سورج کی روشنی میں
ہر کارِ نامناسب کرتے ہیں چھپ چھپا کر

کرتے ہو بادہ خواری سورج کی روشنی میں
رہتے ہیں پرسکوں جو راتوں کی تیرگی میں
ان کو ہے بے قراری سورج کی روشنی میں
راتیں گزارتے ہیں فاتحؔ جو قہقہوں میں
کرتے ہیں آہ و زاری سورج کی روشنی میں

(ص:71)

شعرِ اول میں عرفانِ ذات کا حوالہ پایا جاتا ہے۔شاعر اس امر پر اظہارِ مسرت کر رہا ہے کہ ہماری وفا ہمارے دوست پر عیاں ہے کیونکہ یہ ایسی الم نشرح ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سورج کی روشنی ہے۔دوسرے شعر میں رویہء ملامت اختیار کیا گیا ہے۔ مے خوار سے کہا گیا ہے کہ لوگ ہر نامناسب کام چھپ کر اور چوری چپکے کرتے ہیں مگر تمہاری جسارت کا یہ عالم ہے کہ بادہ خواری جیسا مذموم عمل دن دہاڑے کرتے ہو۔اسے ڈھٹائی اور بے شرمی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا اس سے گریز کرنا چاہیے۔تیسرا شعر زاہدانِ شب بیدار کے حوالے سے ہے جو راتوں کو خوب اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور نقد سکونِ دل پاتے ہیں۔مگر دن کو مختلف مصروفیتوں اور خل اندازیوں کے باعث وہ بے چین رہتے ہیں۔ چوتھا شعر جو غزل کا مقطع بھی ہے، غافل انسانوں کے تناظر میں ہے کہ جن کی راتیں بزم آرائیوں اور قہقہوں کی نذر ہو جاتی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی بندگی کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ انہیں سورج رشنہ پریشانیوں اور دکھوں کے باعث آہ وزاری کرنا پڑتی ہے کہونکہ جو لوگ اپنے مالک کو خوش نہیں کرتے اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی بلکہ وہ ناراضی کے باعث انہیں پریشانیوں اور صعوبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ان اشعار کی ردیف ''سورج کی روشنی'' بھی خود میں ایک ندرت کا پہلو رکھتی ہے۔

غزل مابعد میں دو شعر زمانہ شناسی کے آئینہ دار ہیں۔

ادھر اک سوز ہے دل میں ادھر اک مسکراہٹ ہے
خدا معلوم ، ہے کیسا تعلق آب و آتش میں
اگر ہم روٹھ بھی جائیں منانے کون آئے گا؟
مرے محبوب پھر کیا فائدہ ایسے میں رنجش میں

(ص:75)

شعر اول تمثیلی نوعیت کا شعر ہے۔ ایک انسان آبی خواص رکھتا ہے جس میں شوق موجزن ہے جبکہ دوسرا آتش مزاج ہے اور وہ کبھی کبھی ہلکی سی مسکراہٹ سے اپنے طالب کو نوازتا ہے۔ شاعر کے بقول آب و آتش کا یہ تعلق ناقابلِ فہم ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر اپنی قدرِ ذات کا جائزہ لے رہا ہے۔ اگر ہم کسی سے روٹھ بھی جائیں تو کوئی ایسا نہیں جو ہمیں منانے آئے۔ پھر ایسی خفگی کا کیا فائدہ..... دونوں اشعار میں محبوب شناسی اور معاملہ فہمی کی قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ اصل میں اندازِ محبوب ہو یا قدرِ ذات، دونوں کا زمانہ شناسی سے گہرا تعلق ہے۔

اس کے بعد والی غزل میں بھی دو اشعار زمانہ شناسی کی نسبت سے پائے جاتے ہیں۔

ہمیں اتنی محبت سے نہ دیکھو ہے یہ اندیشہ
کوئی حسرت کوئی سوئی نراشا جاگ اٹھے گی
سنیں گے ناقدینِ فن ہمارے شعر جب فاتحؔ
زبانوں پر حدیثِ میر و مرزا جاگ اٹھے گی

(ص:76)

شعر اول میں محبوب سے تخاطب ہے کہ تم جس محبت سے ہمیں دیکھ رہے ہو، یہ اندیشہ ہے کہ اس کے باعث دل میں کوئی حسرت یا کوئی سوئی ہوئی آرزو نہ جاگ اٹھے۔ ہر چند کہ پیار سے دیکھا جانا عاشق کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے مگر یہ ان کی احتیاط پسندی ہے

کہ کہیں اس سے کسی بڑی آزمائش سے دوچار نہ ہو جائے کیونکہ اس سے بندِ ضبط ٹوٹنے کا بھی احتمال پایا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر مذکور معاملات کو درست سمت میں رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے شعر میں جو دراصل غزل کا مقطع بھی ہے، ایک بھرپور تعلّی پر مشتمل ہے۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کہتے ہیں کہ ہمارے اشعار جب فروغ پائیں گے جب ان کے بارے میں گفتگو ہوگی اور جب ان کا جائزہ لیا جائے گا تو میر تقی میر اور مرزا اسداللہ خان غالب کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ یہ اشعار بحر ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

آمدہ غزل زمانہ شناسی کی نسبت سے چھ اشعار کی حامل ہے جنہیں ہم بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین کرتے ہیں۔

دم پہ تکیہ ایک پل کا بھی نہیں
اور ہم کو ڈر اجل کا بھی نہیں

ایک طولانی سفر درپیش ہے
ہونے والا بوجھ ہلکا بھی نہیں

ہم نے اظہارِ الم بھی کر لیا
آنکھ سے اک اشک چھلکا بھی نہیں

عین ممکن ہے محل میں بھی ملے
حسن زندانی محل کا بھی نہیں

تھل میں جولانی دکھا سکتا ہے عشق
عشق پر باشندہ تھل کا بھی نہیں

ملگجا فاتح نہیں یہ شام کا
یہ سویرے کا دھندلکا بھی نہیں

(ص:77)

غزل مابعد میں اس کیفیت کا ایک شعر پایا جاتا ہے۔

جانے کیوں اک دنیا سرگرداں ہے؟
ذائقہ کچھ خاص پھل کا بھی نہیں

(ص:78)

شعر ہذا میں امکانی طور پر ثمرِ محبت کی بات کی جا رہی ہے ۔ ہر چند کہ اس کا کچھ خاص مزہ نہیں ہے لیکن ایک دنیا اس کے لیے سرگرداں ہے ۔ یہ ایک حقیقت پسندانہ شعر ہے جس میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ لوگ جس محبت کے دیوانے ہوئے پھرتے ہیں، اس کا کوئی زیادہ لطف بھی نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس میں لاحاصلی زیادہ ہے۔ لہٰذا اہلِ دنیا کو اس کے بارے میں خاصا محتاط ہونا چاہیے۔ مثل مشہور ہے کہ اونچی دکان پھیکا پکوان۔ مشہور لوک گیت ہے:

کملی نہ لا اکھیاں، اے خان تاں خان ہوندِن
اُچیاں دکاناں دے پھکے پکوان ہوندِن

گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں بڑے رازدارانہ انداز میں محبت کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ حالانکہ حضرتِ فاتح شاعرِ رومان ہیں مگر کبھی کبھی ایسی انوکھی بات بھی کر جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں بصیری اور غور وفکر کے امکانات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ شعر بحر رمل مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں۔

آمدہ غزل میں موضوعاتی اعتبار سے ایک شعر لائقِ التفات ہے۔

میں سادہ لوح ، صورتِ دہقانِ کم شناس
تم دھوکے باز آج کل کے پیر کی طرح

(ص:92)

شعر ہذا کے مصرع اولیٰ میں سخنور خود کو بے حد سادہ قرار دیتا ہے جس کے لیے اس نے دہقانِ کم شناس کی تشبیہ استعمال کی ہے۔ جو قرینِ فطرت ہے اور مدِ مقابل کے لیے نیز ممکنہ طور پر محبوب کے لیے اس نے دھوکے باز کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسے عصرِ حاضر کے پیروں سے تشبیہ دی ہے جو سادہ لوح عوام کا سب کچھ ٹھگ کر لے جاتے ہیں۔ شعر ہذا رومان کے علاوہ سیاسی طور پر سیاست اور اہلِ سیاست پر بھی دال ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ شناسی کے حوالے سے ہر طرح کے پرفریب طبقوں کی نقاب کشائی یہ شعر کر رہا ہے جو لوگوں کو بدھو بناتے رہتے ہیں۔

غزل مابعد میں زمانہ شناسی کے تناظر میں دو اشعار قابلِ ذکر ہیں۔

ناصح کو میں نے جانا اُس دم رقیب اپنا
وہ لب پہ نام تیرا جو بار بار لایا

جو تار تار میرے اشکوں سے ہو چکا تھا
میں اُس دریدہ دامن کا تار تار لایا

(ص:95-96)

شعر اول میں حضرت ناصح کا خاکہ اڑایا گیا ہے یوں تو بڑا معتبر بنتا تھا لیکن جب وہ بھی بار بار تیرا نام لب پر لا تا رہا تو مجھ پر یہ بھید منکشف ہوا کہ وہ بھی مرے حلقہء رقیباں میں شامل ہے۔ بقول غالب:

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

شعر ثانی میں تکرارِ لفظی ذو معنین کی خوبی پائی جایت ہے جسے آپ رعایتِ لفظی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ مصرع اولیٰ میں تار تار ہونا بمعنی تر بہ تر ہونا اور مصرع ثانی میں تار تار لایا یعنی اس کا ایک ایک دھاگہ محفوظ کر لایا۔ اسے ہم ادب برائے ادب کی عمدہ کاوش قرار

دے سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ سخنور کا مقصود یہ ہے کہ میرا دامان و گریبان جو اشکوں سے تر بہ تر ہو چکا تھا، میری نظر میں ایسا مکرم و معتبر ہے کہ میں نے اس کا ایک تار بھی ضائع نہیں جانے دیا اور پوری طرح اس کی حفاظت کی ہے۔ اس سے کتھارسز کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر وہ کتنی ناگزیر ہے یہ اشعار بحر سریع مثمن مخبون مکسوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن ہیں۔ سریع بروزن ''امیر'' مشتق ہے سرعت سے، سرعت کے معنی شتابی کے ہیں۔ چونکہ یہ بحر جلد پڑھی جاتی ہے، لہٰذا اس کا نام سریع پڑ گیا ہے۔

آگے آنے والی غزل میں دو اشعار موضوعِ مذکور کے ضمن میں دستیاب ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

اک ہم ہیں کہ خود کو ہی نادان سمجھتے ہیں
اپنے لئے دنیا میں ہر شخص ہے فرزانہ
فاتحؔ مری نظروں میں مدت سے معمہ ہے
کچھ تم ہی کہو یارو دانا ہے کہ دیوانہ

(ص:98)

شعر اول میں ذاتی حوالے سے بات کی گئی ہے۔ ہماری کسرِ نفسی اور انکساری کا یہ عالم ہے کہ خود کو ہیچ مداں سمجھتے ہیں اور لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہمارے سامنے افلاطونِ دوراں بنتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جب آدمی اپنی ذات کی نفی کرنے لگتا ہے تو لوگ اس کے سامنے شیر بن کر آنے لگتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر شعر میں موجود فضا کو ہم سپر ایغو یا وسعتِ ظرف کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اس میں خود غرضی کی مذمت کا ایک پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ نیز منکسر المزاج آدمی کے ساتھ اہلِ زمانہ کا رویہ بھی مترشح ہوتا ہے۔ منطقی نتیجے کے طور پر اس میں خلوص و مروت کی جھلیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ شعر ثانی جو دراصل غزل کا مقطع بھی ہے، شاعر اپنی

نظر میں خود کو چیستاں ثابت کر رہا ہے۔ بقول اس کے میں تو اپنے بارے میں الجھاؤ میں مبتلا ہوں۔ کچھ دوست ہی بتا سکتے ہیں کہ فاتح نامی انسان کس درجے پر فائز ہے۔ آیا وہ دیوانہ ہے یا دانا ہے۔ ان کی رائے ہی زیادہ صائب و ثابت ہو سکتی ہے۔ گویا فیصلہ احباب یا قارئین کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے۔ ہم اسے جمہوری طرزِ فکر کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ یعنی اپنے بارے میں لوگوں کی رائے کو معتبر جاننا ہر عہد میں پسندیدہ خیال کیا جاتا رہا ہے۔

غزل مابعد میں زمانہ شناسی کی نسبت سے چار اشعار جا گزیں ہیں۔

وہی جوشِ جنوں ہے ہمیں ہیں
تمناؤں کے دل میں دمدمے ہیں
ترے انداز کی نیرنگیوں سے
دلِ وحشی میں کیا کیا واہمے ہیں؟
سحر ہوتے ہی بادل چھٹ گیا ہے
تم آئے ہو تو آنسو بھی تھمے ہیں
سراپا جور سمجھے تھے جنھیں ہم
وہ ہم پر مہرباں سے اس سمے ہیں

(ص:99)

شعر اول جو غزل کا مطلع بھی ہے، شاعر قلبی کیفیات کا ذکر کرتا ہے جسے آپ داخلی اظہار کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ چنانچہ کہا جا رہا ہے کہ اس عمر میں بھی ہمارا جنوں پہلے کی طرح جوش میں ہے اور ہمارے عزائم بڑے مضبوط ہیں۔ ہمارے دل میں اب بھی آرزوئیں جواں ہیں اور انہوں نے فوجیوں کی طرح دمدمے بنا رکھے ہیں یعنی وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مورچہ زن ہیں۔ دوسرے شعر میں شاعر محبوب سے مخاطب ہے اور عرض پرداز ہے کہ تیرے انداز تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ عجیب عجیب رنگ اختیار کرتے

ہیں جس کے باعث ہمارے دروں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں اور واہمے جنم لیتے ہیں۔ گویا ہمارا یوں پریشان رہنا بھی درحقیقت تیری اداؤں کے مدوجزر کا نتیجہ ہے۔ تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ غموں کا بادل جو ہماری ہستی پر مستولی تھا، صبح ہوتے ہی چھٹ گیا ہے۔ بالکل ایسا ہے جیسے تمہارے آنے سے پریشانی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ دراصل شعر ہذا میں ایک خوبصورت تمثیلی انداز موجود ہے جس میں محبوب کو کرشماتی شخصیت گردانا گیا ہے۔ تشبیہات وتمثیل سے مظاہرِ فطرت کا استخدام خوب لطف پیدا کررہا ہے۔ دراصل فطری رچاؤ کے باعث یہ شعر آمد کا خوبصورت مظہر قرار پاتا ہے۔ شعر چہارم میں کہا گیا ہے کہ ہم تو اپنے دوست کو سراپا جور وجفا قرار دیتے تھے لیکن اب جبکہ وہ ہم پر اتنا مہربان ہے، اسے ہم اپنی خوبیٔ قسمت کا نام دے سکتے ہیں۔ اس شعر میں ایک دلکشا اور رجائی تاثر بھی پایا جاتا ہے جسے ہم احساسِ طرب کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعر ایک صحت مند شعری فضا تشکیل دے رہا ہے۔

بعد ازاں ایک مکمل غزل زمانہ شناسی کی نقیب ہے جسے ہم تبصرے کے بغیر ہی نذرِ قارئین کررہے ہیں۔

مانا کہ وقت ایک سا دائم نہیں رہا
جب تو بھی اپنے عہد پہ قائم نہیں رہا

تھے باغِ دل میں کتنے ہی گلہائے آرزو
اک بھی ہوائے یاس میں سالم نہیں رہا

آمادۂ جفا ہوا اس وقت اپنا دل
مشقِ ستم کو جب کوئی ظالم نہیں رہا

ہے شترِ بے مہار کی صورت وہ شاعری
جس میں ردیف ، قافیہ لازم نہیں رہا

کہتے تھے رو کے اہلِ فن فاتحؔ کی موت پر
ملکِ سخن کا باوفا خادم نہیں رہا

(ص:118)

اس سے بعد والی غزل میں ایک شعر موضوع سے مناسبت رکھتا ہے۔

اب کہ شبِ ہجراں کی سحر ہو نہ سکے گی
اے ملکۂ امید یہ کیا سوچ رہا ہوں

(ص:120)

شعر ہذا میں شاعر امید کو مجسم کر کے ملکہء امید کا نام دے کر مخاطب کر رہا ہے کہ تجھ سے نسبت رکھنے والا عجیب واہموں اور نراشا میں مبتلا نظر آتا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ اس بار جدائی کی رات ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ گویا سحر ہونے کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ یہ کیسے امکانات تیرے قدر شناس کے دل میں پیدا ہو گئے ہیں۔ گویا اپنے عالمِ یاس کا الزام وہ اپنی امید پسندی کو دے رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ یہ کیسے حالات پیدا ہو گئے ہیں اور ان کے نتیجے میں کیسی سوچ پروان چڑھ رہی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعر ہذا میں امید کی تجریدی فضا پائی جاتی ہے جسے ہم سخنور کی فنی چابک دستی قرار دے سکتے ہیں۔

اس سے بعد والی غزل میں موضوعاتی حوالے سے تین اشعار پائے جاتے ہیں۔

ساقی کا شوقِ دید ہی محفل میں لاتا ہے
واللہ سچ کہ میں نہیں عادی شراب کا

یارب عجیب چیز ہے ذوقِ گناہ بھی
مستی میں بھول جاتا ہے سب ڈر عذاب کا

سمجھا نہیں ہے کوئی بھی پوری طرح مجھے
پھاڑا ہوا ورق ہوں میں وسطِ کتاب کا

(ص:122)

پہلے شعر میں شاعر واضح کر رہا ہے کہ ہم اگر ساقی کی محفل میں آتے ہیں تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہمیں ساقی کا شوقِ دیدار ہی کھینچ لاتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں شراب سے کوئی شغف نہیں ہے یعنی ہم محبت کیش ہیں، نشہ باز نہیں ہیں۔ لہٰذا لوگوں کو ہمارے بارے میں اپنا تاثر درست کر لینا چاہیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شعر ہذا میں خمریاتی انداز میں خمریات کی نفی کی گئی ہے جسے ایک پسندیدہ انداز کہا جا سکتا ہے۔ جو زیادہ موثر بھی ہے۔ دوسرے شعر میں ذوقِ گناہ کو ایک حیرت انگیز جذبہ قرار دیا جا رہا ہے جو آناً فاناً دماغ پر یوں چھا جاتا ہے کہ مالک کے ناراض ہونے اور مبتلائے عذاب ہونے کے خوف کو بھی کافور کر دیتا ہے۔ تیسرے شعر میں سخنور اہلِ دنیا سے گلہ گزار ہے کہ اسے کوئی بھی سمجھ نہیں سکا۔ دراصل شاعر کی ہستی ہی ایسی ہے جیسے کسی کتاب کے درمیان کا پھاڑا ہوا ورق ہو ورنہ اگر ابتدائی یا آخری ورق ہوتا تو قرینِ فہم ہوتا۔ اس شعر میں سخنور نے فنی چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک خوبصورت اندازِ سخن برتا ہے جس میں عجز وانکسار کا پہلو پایا جاتا ہے۔

ازاں بد ایک نظم بعنوان ''ندائے عوام'' سامنے آتی ہے۔ نظم کی ہیئتِ کذائی گیت سے مشابہت رکھتی ہے۔ نذرِ قارئین ہے۔

ہو دفع بھی اے حاکمِ نااہل و غلط کار
معلوم بھی ہے تجھ کو کہ سب تجھ سے ہیں بیزار
تُو دین ، کا ایمان کا ، جمہور کا دشمن
فنکار کا ، دہقان کا ، مزدور کا دشمن
ہے تیرا عمل سب کے لئے باعثِ آزار
تُو ملک کا جلاد ہے ، تُو قوم کا قاتل
ہو سکتی نہیں تجھ سے تمیزِ حق و باطل

گردانے گی تاریخِ زمانہ تجھے غدار
لاشوں کے ترے حکم سے لگ جاتے ہیں انبار
طُلّاب ترے شر سے ہیں محفوظ نہ عالم
ہر سمت ہیں چرچے تری بے داد کے ظالم
چنگیز کے زمرے میں نہ آ جائے ترا نام
رکھ یاد تُو نمرود کا ، فرعون کا انجام
ڈر قہرِ خدا سے ، کہیں ہو جائے نہ فی النار
مغلوب کیے دیتے ہیں اب تجھ کو یہ احرار
کُرسی یہ ترے باپ کی جاگیر نہیں ہے
اب تیری مؤثر کوئی تدبیر نہیں ہے
تُو جھوٹا ہے وعدوں کا تجھے پاس نہیں ہے
بڑھتی ہوئی بربادی کا احساس نہیں ہے
تُو جاہ طلب کتنا ہے اے سفلہ و میخوار
چل پائے گی کب تک یہ مظالم کی سیہ رات
اب کایا پلٹ ہونے کو ہیں قوم کے حالات
معصوم رِہا ہوں گے ، جفا کار گرفتار
اسلام سے واقف ہے نہ قرآن سے آگاہ
پھر کیسے ہو تُو جذبۂ ایمان سے آگاہ
ہم تجھ کو گرائیں گے تو ہے راہ کی دیوار
ہم دنیا میں پھیلائیں گے اسلام کے انوار
ہم حق کے لئے گولیاں کھاتے ہی رہیں گے

دم تجھ کو حکومت سے الگ کر کے ہی لیں گے

(ص:124-125)

درحقیقت یہ ایک مزاحمتی نظم ہے جس میں حکمران سے بیزاری اور اس سے لعنت ملامت کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ دراصل یہ نظم تحریکِ نفاذِ اسلام کے دوران لکھی گئی تھی جب ساری دینی جماعتیں متحد ہو کر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تھیں۔ اسے سیاسی شہرِ آشوب کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ جس میں واضح طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ وزارتِ عظمیٰ کی کرسی تیرے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ عوام کی امانت ہے۔ اب جبکہ عوام تجھ سے تنگ آ چکے ہیں، تجھے چاہیے کہ تو اس کرسی سے دستبردار ہو جا اور عزت و آبرو کے ساتھ اپنے گھر جا بیٹھ۔ اس نظم میں یہ بھی عیاں ہے کہ حاکمِ وقت لادین سیاست سیکولرازم پر یقین رکھتا ہے۔ گویا یہ مزاحمتی شاعری کا ایک بھرپور انداز ہے۔ نظم کا اختتام ایک زبردست انقلابی انداز میں کیا گیا ہے۔ نظم ہذا بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف مقصور میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان مفعول مفاعیل مفاعیل مفاعیل ہیں۔

آئندہ آنے والی غزل کے جملہ اشعار زمانہ شناسی کے مختلف رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہم پر چسپاں
کتنے بہتاں
درد کا درماں
کر دو جاناں
ذہن پریشاں
آنکھیں ویراں
نائبِ یزداں

اچھا انساں
نین ہیں گریاں
صورتِ باراں
یار ہمارا
نیّرِ تاباں
دل بے دل ہے
جان ہے بے جاں
دیس ہے اپنا
غیرتِ کنعاں
بڑھتا جائے
من کا طوفاں
ہجر میں جلنا
موت کا امکاں
دل میں کتنے
درد ہیں پنہاں
آپ کا فاتحؔ
فاتحؔ میداں

(ص:153-154)

ان اشعار یا اس غزل کا حصول یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے الزامات ہم پر چسپاں ہوتے ہیں۔ ہماری تکالیف اور غم وآلام کا علاج ہمارے محبوب کے پاس ہے۔ دنیا کے حالات دیکھتے ہوئے ہمارا ذہن الجھ گیا ہے اور آنکھوں میں ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ اللہ

تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ اچھا انسان وہی ہے جو نیابت کی مقتضیات کی تکمیل کرے۔ ہماری آنکھوں سے ہر وقت اشک رواں ہیں۔ جیسے بارش برستی رہتی ہے۔ ہمارا دوست کوئی معمولی آدمی نہیں ہے بلکہ مہرِ درخشندہ کی مانند ہے۔ حالت یہ ہے کہ دل محرومِ آرزو ہو چکا ہے اور جان بے جان ہے۔ حقیقت میں اپنا وطن رشکِ کنعان ہے۔ دل میں طوفان اٹھ رہے ہیں اور ان میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جدائی خوف ناک چیز ہے۔ حتیٰ کہ اس میں جلنے والا موت کے قریب تر ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے دل میں کوئی غم نہیں ہے بلکہ درحقیقت ہم بہت سے درد چھپائے رکھتے ہیں۔ آخری شعر جو غزل کا مقطع ہے، شاعرانہ تعلّی کا حامل ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپ کا فاتح کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ یہ فاتحِ میدان ہے۔ مختصر وزن کی حامل یہ غزل چار اضافی مطلعوں کا حسن لیے ہوئے ہے۔ ایک خوبی اس غزل کی یہ بھی ہے کہ عروضی حوالے سے یک رکنی نوعیت کی ہے۔ یہ غزل بحر اوفر میں کہی گئی ہے جس کا رکن مفعولاتن ہے۔ واضح رہے کہ اس بحر کا شمار بحورِ مستحدثہ میں ہوتا ہے۔ یہ ایسی بحور ہوتی ہیں جن کے اوزان دیگر بحور سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہ بحور عہدِ امیر خسرو میں عاشق صادق نامی ماہرِ عروض نے ایجاد کیں۔ رسالہ "جامع الصنائع" میں مذکور ہے۔ مذکورہ بحر کا وزن بحر متقارب اور بحر متدارک سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ فاتح کا کمالِ فن یہ ہے کہ ایک رکنی وزن میں ایسے عمدہ اشعار نکالے، یہ صرف انہی کا ہی اختصاص ہے۔

غزل مابعد بھی تمام و کمال سماجی رویوں اور زمانہ شناسی کے حوالے سے ہے جسے ہم بدونِ تبصرہ قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

تِرے زاویے کئی اور بھی
مِرے آئینے کئی اور بھی
میں کہاں کہاں رہوں منتظر
تِرے راستے کئی اور بھی

تجھے محض ایک ملال ہے
مِرے سانحے کئی اور بھی
مجھے ایک درد بہت نہیں
مجھے رنج دے کئی اور بھی
مجھے ایک ذات کا آسرا
تِرے آسرے کئی اور بھی
نہیں سوز و ساز فقط یہاں
ہیں یہاں مزے کئی اور بھی
ہے خمارِ شوق بچا ہوا
تھے مجھے نشے کئی اور بھی
نہیں تین چار شکاتیں
ہیں مغالطے کئی اور بھی
تمھیں چند زخم دکھا سکا
لگے آبلے کئی اور بھی
نہیں صرف سادہ مزاج تم
یہاں لٹ گئے کئی اور بھی
تِرے ایک رنگ میں کھو گئے
تِرے روپ تھے کئی اور بھی
نہیں ایک شمع یہاں بجھی
دیے جل بجھے کئی اور بھی
نہیں ایک فاتحِ بے نوا

یہاں مر مٹے کئی اور بھی

(ص:155-156)

اسی طرح لگا تار تیسری غزل بھی موضوع سے متضمن ہے اور اس کے جملہ اشعار زمانہ شناسی کے مظہر ہیں۔

نہ کوئی بات سنے گا ، ہمیں امید نہ تھی
خلوص مہنگا پڑے گا ، ہمیں امید نہ تھی

اِسی خطا پہ کہ رکھتے ہیں خامۂ صادق
ہمارا ہاتھ کٹے گا ، ہمیں امید نہ تھی

زہے یہ ناز ، یہ توقیر کہ سرِ مقتل
ہمارا سر ہی سجے گا ، ہمیں امید نہ تھی

سنا تو تھا کہ وفا کا سفر مبارک ہے
نہ پاس کچھ بھی بچے گا ، ہمیں امید نہ تھی

ہمیں جو ایک مسیحا نفس نے بخشا ہے
وہ سوز جینے نہ دے گا ہمیں امید نہ تھی

وہ ایک شخص بنایا تھا ہم قدم جس کو
ہمیں تباہ کرے گا ہمیں امید نہ تھی

کیے تھے اتنے جتن جس کے قرب کی خاطر
وہ دور جا کے بسے گا ، ہمیں امید نہ تھی

ہمارا مقصدِ ہستی تھا جس کو اپنانا
ہمارا ہو نہ سکے گا ہمیں امید نہ تھی

خیال تھا کہ اڑائیں گے لوگ اپنی ہنسی

جنوں میں رنگ جمے گا ہمیں امید نہ تھی
یہ سوچتے تھے کہ وقتی ہے بارشِ گریہ
نہ نیرِ سَیل تھمے گا ہمیں امید نہ تھی
برا کہا تھا جو غیروں نے کچھ ملال نہ تھا
خراب تو بھی کہے گا ہمیں امید نہ تھی
سبق دیا تھا ہمیں جس نے حق بیانی کا
ہمارے ہونٹ سئے گا ہمیں امید نہ تھی
وہ ہم سفر ہے ہمارا ، ہمیں تھی خوش فہمی
قدم نہ اس کا اٹھے گا ، ہمیں امید نہ تھی
جگر کے پار اترتے ہیں صورتِ نشتر
تو ایسے شعر کہے گا ہمیں امید نہ تھی
عزیز ہم کو رہیں کامیابیاں جس کی
وہ شخص ہم سے جلے گا ، ہمیں امید نہ تھی
وہ غم کہ صورتِ درِ یتیم ہے فاتحؔ
ہمارے ہاتھ لگے گا ، ہمیں امید نہ تھی

(ص:157-158)

ہم جس ماحول میں رہ رہے ہیں، ہمیں یہ امید نہ تھی کہ ہماری بات نہ سنی جائے گی۔ علاوہ ازیں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ہمارا خلوص ہمیں بہت مہنگا پڑے گا۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا قلم سچائی لکھنے والا اور حق بیان ہے لیکن ہمیں یہ امید ہرگز نہ تھی کہ ہمیں اس کے باعث تکالیف و مصائب سے گزرنا پڑے گا اور ہمارے ہاتھ قلم کیے جائیں گے۔ بقول ابو البیان ظہور احمد فاتحؔ:

ہے آج شادمان ایک خنجر بدست شخص
جس ہاتھ میں قلم تھا قلم ہو گیا وہ ہاتھ

ہمارے لیے یہ امر باعثِ افتخار ہے کہ سرِ مقتل ہمارا سر ہی سجایا جائے گا۔ حالانکہ ہمیں اس کی امید نہ تھی۔ ہم سنتے آئے تھے کہ وفا کا سفر باعثِ برکت ہے مگر ہمیں یہ امید قطعاً نہیں تھی کہ بظاہر اس مبارک سفر میں ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ویسے تو ہمیں بہت سے روگ لاحق تھے لیکن ایک مسیحا نفس شخص نے جو سوز عطا کیا ہے وہ ہمیں جینے نہیں دیتا۔ یہ تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ ہمیں تباہ و برباد کر رکے رکھ دے گا۔ ہم عمر بھر جس کی قربت کے لیے کوشاں رہے تھے، وہ شخص ہم سے کہیں دور جا کر بسے گا۔ ہمیں یہ امید نہ تھی کہ وہ کبھی ہمارا نہیں ہو سکے گا۔ ہم تو ڈر رہے تھے کہ لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ لیکن جنوں میں یوں ہمارا رنگ جم جائے گا، ہمیں یہ امید نہیں تھی۔ ہم سوچا کرتے تھے کہ ہمارا یوں رونا دھونا وقتی نوعیت کا ہے، رفتہ رفتہ صبر آ ہی جائے گا لیکن ہمیں یہ امید نہ تھی کہ نیروں کا یہ سیلاب تھمنے کا نام ہی نہیں لے گا۔ غیر تو برا بھلا کہتے ہی رہتے ہیں مگر ہمیں یہ امید بالکل نہیں تھی کہ تو بھی ہمیں خراب کہے گا۔ ایک شخص نے ہمیں حقِ بیاں کا درس دیا تھا اور ہم اس کے زیرِ ہدایت اپنے اشعار کے ذریعے حق بیانی پر کمربستہ ہو گئے تھے لیکن وہ شخص ہمارے ہونٹ سینے لگا۔ ہمیں یہ آس ہرگز نہیں تھی کہ ہم جس شخص کو اپنا ہم سفر سمجھ بیٹھے تھے، وہ سراسر ہماری خوش فہمی تھی۔ ہمیں یہ امید نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکے گا۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ تیرے اشعار تیر و نشتر کی طرح جگر کے پار اُترنے لگے ہیں۔ حالانکہ ہمیں یہ امید نہیں تھی کہ تو ایسے سخن لکھے گا۔ ہم جس کی کامرانیوں کے آرزومند رہے، اور جس کی کامیابیاں ہمیں عزیزِ جاں تھیں، وہ شخص ہم سے حسد کرنے لگے گا۔ یہ بات تو کبھی ہمارے احاطہء گماں میں بھی نہیں آئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارا غم ایک نادر موتی کی طرح ہے۔ یوں ہمارے ہاتھ لگ جائے گا۔ یہ کبھی ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔ غزل ہذا کی ردیف

کے تناظر میں اس کے تمام اشعار کا فکری مزاج خلافِ توقع معاملات کا بیان ہے۔

کتاب مذکور کی آخری غزل جو پوری کی پوری زمانہ شناسی کے پس منظر میں کہی گئی ہے، تبصرے کے بغیر قارئین کی صوابدید پر چھوڑے دیتے ہیں۔

ہمیں بنا کے رزقِ ریگ زار ، وہ چلا گیا
تھا کوہ زاد ، سوئے کوہسار ، وہ چلا گیا
تھا معتبر مگر نہ قول کوئی بھی نبھا سکا
ہمیں تھا جس پہ اتنا اعتبار ، وہ چلا گیا
جنونِ شوق میں لگا تھا بے مثال آدمی
ملا وہ ہمسفر تو دشت پار ، وہ چلا گیا
وہ خوش لباس شخص تھا مگر نجانے کیا ہوا؟
قبا کو اپنی کر کے تار تار ، وہ چلا گیا
اب اس کے بعد جیسے دور نفرتوں کا آ گیا
جو انجمن میں بانٹتا تھا پیار ، وہ چلا گیا
بلا لیا تھا ہم نے چارہ ساز جان کر جسے
لگا کے دل پہ زخم بے شمار ، وہ چلا گیا
عجیب شخص تھا کہ خود تو پت جھڑوں کی زد میں تھا
ہمیں دکھا کے رنگِ نو بہار ، وہ چلا گیا
وہ امتحان لے رہا تھا کیا ہمارے زہد کا؟
ذرا نگاہیں کر کے ہم سے چار ، وہ چلا گیا
کریں گے ناز کس کی دوستی پہ کس کے پیار پر؟
ہمیں تھا جس پہ اتنا افتخار ، وہ چلا گیا

اجڑ رہا ہے آج گلشنِ خلوص ، دوستو!
لگا تھا مہر کا جو پاسدار وہ چلا گیا
بغیر اس کے زیست ہے حقیر سی ، فقیر سی
بنا تھا جو حیات کا وقار ، وہ چلا گیا
اب اس کے بعد کون حرفِ زرفشاں لٹائے گا؟
قلم تھا جس کے پاس زرنگار ، وہ چلا گیا
اسے بتایئے گا آئے جب وہ فاتحِ غزل
یہاں جو تھا تمھارا جاں نثار ، وہ چلا گیا

(ص:159-160)

کسی نے سچ کہا ہے:

؎ شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

ایک سچا سخن ور اپنے زمانے پر نگاہ رکھتا ہے اور اس کی ایک ایک ادا کا جائزہ لیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تجزیہ بھی کرتا جاتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہونا چاہیے، کیا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ زمانے کی ناہمواریوں، ناشائستگیوں اور شائستگیوں کا مبصر ہوتا ہے اور اپنے انداز میں اپنے ہم عصروں کو مناسب مشوروں سے بھی نوازتا رہتا ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ حال کے ساتھ ساتھ مستقبل کی پیش بندی بھی کرتا ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

کبھی وہ پسندیدہ واقعات کی نسبت سے لکھتا ہے اور اظہارِ تہنیت کرتا ہے اور کبھی ناپسندیدہ اقدار کے حوالے سے رقم طراز ہوتا ہے اور اس کا خاصہ محورِ رجز و توبیخ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کا انداز کہیں کم کہیں زیادہ شعرائے کرام کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ابو البیان ظہور

احمد فاتح کے مجموعہ ء کلام ''صبحِ بہاراں'' کے حوالے سے زمانہ شناسی کے تناظر میں جو استشہادات و استخراجات پیش کیے گئے ہیں، وہ بھی کافی و شافی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کہیں انہوں نے اپنے منصبِ ذمہ داری سے کوتاہی نہیں برتی اور حسبِ حال جو ضروری تھا، وہ کہتے چلے گئے۔ کہیں انہوں نے یہ پروا نہیں کی کہ محققین و ناقدینِ زمانہ انہیں کیا کہیں گے بلکہ مخلصانہ طور پر کہیں مشفقانہ انداز میں اور کہیں سرزنش کے انداز میں ہمیشہ بات چلاتے رہے۔ ہمیں ان کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ ہماری یہ تصنیف ان کی کاوشوں کا ایک خوبصورت منظر نامہ ہے جسے کمال دیانت داری سے تیار کیا گیا ہے اور جو بات بھی قابلِ بیان تھی، بلاکم وکاست پیش کر دی ہے۔ جہاں کہیں ضروری ہوا ہے لازمی طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ قارئین و محققین و ناقدین کو ہماری یہ عرق ریزی اور کشیدِ جاں ضرور پسند آئے گی اور اسے فردائی ادوار میں بھرپور انداز میں سراہا بھی جائے گا۔

# باب چہارم

## ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا تصورِ حسنِ آرزو

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرتِ انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اسے دل ودماغ ونطق سے نوازا ہے۔اس کا دل ایک جہانِ آرزو ہے۔اس کا دماغ تفکرات وتصورات کا محور ہے۔ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دل محتاجِ امکانات نہیں ٹھہرتا جبکہ دماغ ان امور پر انحصار کرتا ہے۔جبکہ نطق انسانی ایک بھرپور ذریعہء اظہار ہے۔ایک عمدہ خواہش،ایک اچھا تصور،اور ایک خوب صورت نظریہ انسان کی کمزوری ہے اور اس کا نطق اس کے مافی الضمیر کا ترجمان ہے۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں حسنِ آرزو کے بہت سے پہلو پائے جاتے ہیں۔یہاں ہم ان کے مجموعہءکلام ''صبحِ بہاراں'' مطبوعہ 2022ء میں مرقوم کلام کے تناظر میں استشہادات واستخراجات سامنے لائیں گے اور حسبِ ضرورت ان پر گفتگو کی جائے گی۔علاوہ ازیں ان سے متعلق دیگر فکری وفنی اور لسانی تناظرات کے پہلو بہ پہلو عروضی حوالہ جات کا التزام بھی کیا جائے گا۔ ہماری یہ ایک سعی ہوگی کہ ان کے حوالے سے اجتماعی انتقادی تاثرات بھی عیاں کیے جائیں۔سب سے پہلے نظم بعنوان ''دعا'' جو غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے،اس میں سے ابتدائی شعر نذرِ قارئین ہے۔

یارب! تِری لقا کی سعادت نصیب ہو
کہتا ہے دل کہ جامِ شہادت نصیب ہو

(ص:13)

ہر مسلمان یہ یقین رکھتا ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور بندہ و مولا کی ملاقات ہوگی۔ مگر شاعر اللہ سے ملاقات اس طرح کرنا چاہتا ہے کہ وہ فی سبیل اللہ شہید ہو جائے اور بحیثیت شہد دیدارِ الٰہی سے فیض یاب ہو۔

اس کے بعد والی غزل جو پوری کی پوری حسنِ آرزو کی حامل ہے، جس کے اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

یہ مِرے دوست پیارے سلامت رہیں
میری آنکھوں کے تارے سلامت رہیں
ان کے دم سے ہیں موسم کی رنگینیاں
یہ حسیں ابر پارے سلامت رہیں
ناز و انداز میں ہے تِرے تازگی
تیرے دلکش اشارے سلامت رہیں
یونہی نظروں کو تسکین ملتی رہے
یہ سہانے نظارے سلامت رہیں
گل زمیں کے گلوں پر نہ آئے خزاں
آسماں کے ستارے سلامت رہیں
ان کا برتاؤ جیسا بھی مجھ سے رہا
میرے احباب سارے سلامت رہیں
جن پہ فاتحؔ ملاقات ہوتی رہی
نہر کے وہ کنارے سلامت رہیں

(ص:15)

دوست ہمیشہ پیارے ہوتے ہیں اور زیادہ پیارے لوگ ہی آنکھوں کے تارے

ہوتے ہیں۔ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ وہ ہمیشہ سلامت رہیں۔مسرور و شاد ماں رہیں۔ بادل کو دیکھ کر سخن ور کا دل سرشاری و خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے۔اس لیے ان کی بقا کی دعا کی گئی ہے۔محبوب کی ہر ادا دلکش ہوتی ہے۔اس کے ناز و انداز میں تازگی کا وفور ہوتا ہے۔اس کا عشوہ و غمزہ راحتِ جاں ہے۔اس لیے آرزو کی گئی ہے کہ دوست کے اشارے کنائے بدستور رہ جائیں۔خوب صورت نظارے جانِ ماحول ہوا کرتے ہیں۔اس سے نگاہوں کو طراوت ملتی ہے اور دل سرور پاتا ہے۔ لہٰذا تمنا ہے کہ یہ یونہی سلامت رہیں۔ ارضِ وطن کو گل زمین کہا گیا ہے اور دعا کی گئی ہے کہ اس کے پھول مہکتے رہیں۔اس طرح آسماں کے تارے بھی چراغ ہائے رفعت ہیں، لہٰذا ان کی بقا کے لیے بھی دعا کی جا رہی ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ احباب کیسا برتاؤ کرتے ہیں،ان کے لیے غیر مشروط دعا کی گئی ہے کہ وہ سب سے سب تندرست و توانا رہیں۔نہر کے کنارے یادگار ہیں جن پر محبوب سے ملاقاتیں ہوا کرتی ہیں۔یہ کنارے بھی صحیح و سلامت رہیں۔

مندرجہ بالا استخراجات اگرچہ غزل کی جدا جدا کائیاں ہیں لیکن ان میں فکری طور پر تواتر و تسلسل پایا جاتا ہے جس کے اسباب و علل میں ردیف کے فکری مزاج کا کردار بھی کلیدی نوعیت کا ہے جس نے غزل کو غیر مسلسل دائرے سے نکال کر مسلسل کے زمرے میں لا کھڑا کیا ہے۔غزل کی ردیف ''سلامت رہیں'' اجتماعتی دعا کا تاثر اور حسنِ آرزو کا تموج خود میں سموئے ہوئے ہے جس سے خوشگوار، طربیہ اور رجائی کیفیات مترشح ہیں۔یہ غزل بحر متدارک مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہیں۔

اسی طرح اس سے اگلی غزل بھی حسنِ آرزو کے حوالے سے مالا مال ہے جسے ہم بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین کیے دیتے ہیں۔

کرم کی ہو نظر مجھ پر فقط اتنی گزارش ہے
رہو میرے قریں دلبر فقط اتنی گزارش ہے

ذرا کرتے نظر ثانی جفا و جور پر ساجن
مِرے یارِ کرم گستر فقط اتنی گزارش ہے
مزا آئے گا اس سے قتل ہونے میں، تڑپنے میں
ذرا سا تیز ہو خنجر فقط اتنی گزارش ہے
ذرا صحبت میسر ہو ، ذرا عشرت مقدر ہو
مِرے ساقی مِرے ہمسر فقط اتنی گزارش ہے
الم کا رقص جاری ہے، غضب کی بیقراری ہے
بِلا لبریز اک ساغر فقط اتنی گزارش ہے
پریشاں ہے تِری خاطر، تِرا فاتحؔ ، تِرا شاعر
نہ جا یارِ نظر پرور فقط اتنی گزارش ہے

(ص:16)

اس سے بعد والی غزل میں موضوعاتی حوالے سے ایک شعر قابلِ ذکر ہے۔

حیف صد حیف! آئے جو ہونٹوں پہ حرفِ شکایت کوئی
اپنے دل میں نہاں کتنے طوفان ہیں کاش تم جانتے

(ص:17)

ردیفی اعتبار سے پوری غزل دلچسپی کی حامل ہے۔''کاش تم جانتے'' کہ ہمارے دل میں کتنے ارمان اور کتنے طوفان ہیں لیکن اس کے باوجود کسی بات پر ہم حرفِ شکایت لب پر لانے والے نہیں ہیں۔شعر ہذا بحر متدارک مسدس مضاعف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہے۔

غزل مابعد میں حسنِ آرزو کے حامل دو اشعار موجود ہیں۔

ہر چند اپنے آپ کو ایسا نہ کر سکے

ہستی ہمیں پسند ہے اک پاک باز کی
ممتاز ہم نہ ہو سکے افسوس کی ہے بات
خواہش ہمارے دل میں بھی تھی امتیاز کی

(ص:18)

پہلے شعر میں شاعر اس امر پر اظہارِ عجز کرتا ہے کہ ہم پورے طور پر پاکباز نہیں بن سکے البتہ ہم چاہتے یہی تھے کہ ایک متقی کا سا اندازِ حیات اختیار کریں کیونکہ ایک پاکباز شخصیت ہماری آئیڈیل تھی۔ یعنی رسول محترم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ اس ذاتِ ستودہ صفات سے ہمیں بے پناہ محبت تھی۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں جہاں میں امتیاز حاصل ہو مگر وائے حسرت کہ ہم ممتاز نہیں ہو سکے۔ اس میں یقیناً ہمارا ہی قصور تھا۔

ہماری عرض تو سن لو ذرا قرینے سے
بلا سے پوری کوئی آرزو ذرا نہ کرو

(ص:119)

شعر ہذا میں شاعر اپنے دوست سے متقاضی ہے کہ کم سے کم ہماری گزارش تو پوری توجہ سے سن لی جائے، پھر یہ آپ پر موقوف ہے کہ آپ اسے پورا کریں یا نہ کریں۔

آمدہ غزل کا مقطع متذکرہ بالا موضوع سے نسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

فاتح ترا کلام ہے اپنی مثال آپ
جانِ بیان تیرے اشارے لطیف ہیں

(ص:21)

اس میں کمال شاعرانہ تعلیٰ پائی جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کلام اپنی مثال آپ ہے جس میں موجود لطیف اشارے کنائے جانِ سخن ہیں۔

اس کے بعد ایک نظم بعنوان ''سراپا حسن'' ہے جو نظمِ معریٰ کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

پوری کی پوری نظم محبوب کی تعریف پر مشتمل ہے جو سر سے پاؤں تک تصویرِ حسن وخوبی ہونے کے پہلو بہ پہلو حسنِ آرزو کا تناظر بھی خود میں سموئے ہوئے ہے جو موضوع کے حوالے سے بالواسطہ نوعیت کی حامل ہے۔ نظم ہذا بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔ بحر ہذا کا شمار بحورِ مرکبہ میں ہوتا ہے۔ نظم بدونِ تبصرہ سپردِ قرطاس کی جاتی ہے جس کا تبصرہ قارئین کی صوابدید پر منحصر ہے۔

تو مِری جان! کتنی پیاری ہے
کتنا دلکش ترا سراپا ہے!
رشکِ مہتاب تیرا چہرہ ہے
تیری زلفوں پہ رات قرباں ہے
تیری پیشانی ماہ طلعت ہے
تیری آنکھوں میں رقصِ حیرت ہے
مہکے مہکے ترے گلِ عارض
کتنی سندر لبوں کی کلیاں ہیں
تیری گردن ہے گردنِ مینا
تیرا سینہ طلب خزینہ ہے
شاخِ نازک سی ہے کمر تیری
صورتِ برق ہے نظر تیری
ساقِ زریں یہ ساعدِ سیمیں
تیرا ہر عضو قہر ساماں ہے
تیری قامت کا حشر عنواں ہے

(ص:22)

بعد میں آنے والی غزل میں تین اشعار حسنِ آرزو کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔

تیری فطرت وفا شعاری ہو
تیرا انداز پاکبازی ہے
دلنشیں ہے ترا لب و لہجہ
کیا حسیں شانِ بے نیازی ہے
شاعری عہد ساز ہے فاتح
تیرا اسلوب امتیازی ہے

(ص:23)

پہلے شعر میں اس خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ تجھ میں دو خوب صورت وصف ہوں ایک یہ کہ تجھ میں وفا شعاری کی خوبی ہونی چاہیے۔ دوسری یہ کہ تجھے پاک باز بن کر رہنا چاہیے۔ دوسرے شعر میں محبوب کی ذات میں موجود خوبصورت اداؤں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ اس کا لب ولہجہ دلنشیں ہے۔ دوسری یہ کہ اس میں شانِ بے نیازی بھی عیاں ہے۔ تیسرا شعر جو غزل کا مقطع ہے، شاعرانہ تعلّی کا حامل ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ فاتح جی کی شاعری عہد ساز ہے جو امتیازی اور منفرد رنگ کی حامل ہے۔ اشعار ہذا بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔

اس سے بعد والی غزل حسنِ آرزو کے سات اشعار سے مملو ہے۔ اشعار چونکہ عام فہم ہیں لہٰذا بدونِ تبصرہ قارئین کی نذر کیے جاتے ہیں۔

ترے بغیر سوادِ قمر ہے رنجیدہ
ہے دل فسردہ نہایت نظر ہے رنجیدہ
ہے شام یوں بھی اداسی کے رنگ کی حامل
ترے فراق میں اپنی سحر ہے رنجیدہ

تِری تجلی نہیں ہے جو میرے آنگن میں
تِری جدائی میں دیوار و در ہے رنجیدہ
اے رشکِ ماہ نہیں تو جو گامزن اس پر
تِرے خیال میں اب رہ گزر ہے رنجیدہ
تو سنگ سنگ نہیں ہے تو جانِ من تجھ بن
تِرا رفیق تِرا ہم سفر ہے رنجیدہ
نجانے راز ہے کیا بعد تیرے جانے کے
بہم سرور ہے کوئی مگر ہے رنجیدہ
تو دل نواز ہے کتنا کہ تیری فرقت میں
جنابِ فاتحؔ سا اہلِ ہنر ہے رنجیدہ

(ص:24)

اگلی غزل میں دو شعر حوالے کے پائے جاتے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہانی کا ابھی آغاز مت کرنا
کسی کو اپنی چاہت کا شریکِ راز مت کرنا
کہیں افسوس کے مارے میں تشنہ لب نہ رہ جاؤں
مِرے ساقی مجھے نا حق نظر انداز مت کرنا

(ص:27)

شعر اول غزل کا مطلع ہے جو کسی اور مثلاً حضرتِ ناصح یا محبوب کی طرف سے عمدہ مشورے پر مشتمل ہے۔ جس میں کہا جا رہا ہے کہ ابھی حالات واضح نہیں ہیں لہٰذا اپنی کہانی کسی کو مت سنانا اور خواہ مخواہ اوروں کو شریکِ راز مت کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تو رسوا ہو جائے۔ دوسرے شعر میں ساقی سے گزارش کی جا رہی ہے کہ مجھے اپنی محفل میں نظر انداز

مت کرنا کیونکہ مجھے اس سے افسوس ہو گا اور عین ممکن ہے کہ اس افسوس کی وجہ سے میں پیاسا ہی رہ جاؤں۔شعر ہذا عام روش سے ہٹ کر خمریاتی رنگ کا حامل ہے۔ یہ اشعار بحر ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔اس سے بعد والی غزل محولہ بالا عنوان یعنی حسنِ آرزو کے حامل دو اشعار پر مشتمل ہے۔

تِری یہ وضع داری ہے نشانی اعلیٰ ظرفی کی
خدا کچھ اور برکت دے ترے علمی تبحر میں
مبارک ہو تجھے بخشی گئی ہے قوم کی خدمت
تجھے ہے تجربہ فاتح تعیّن میں ، تقرر میں

(ص:30)

شاعر عالمِ عصر سے مخاطب ہے کہ تجھ میں جو وضع داری کی ادا پائی جاتی ہے، یہ تیری اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے حالانکہ لوگ علم میں یدِ طولیٰ کے نتیجے میں مغرور ہو جاتے ہیں مگر تو ایسا نہیں ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرے علمی تبحر میں مزید برکت عطا فرمائے۔دوسرے شعر میں جو شاعرانہ تعلّی کا حامل ہے، پیغامِ تہنیت دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ کہا جا رہا ہے کہ تجھے قومی خدمت کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے تجھے معاملہ فہمی اور تجربہ کاری سے نوازا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ تو قومی توقع پر پورا اُتر سکے۔غزل میں نادر قوافی استعمال کیے گئے ہیں جو شاعر کے قادر الکلاز ہونے کا بین ثبوت ہیں۔ یہ اشعار ماقبل بحر و وزن میں کہے گئے ہیں۔

آمدہ غزل بھی موضوع کی مناسبت سے دو اشعار کی حامل ہے۔

ممکن ہے پلٹ آؤں میں آنگن میں تمھارے
در اپنی حویلی کا ابھی بند نہ کرنا

اک موجِ تبسم ہے بہت بہرِ ضیافت
اے دوست! مجھے پیش قلاقند نہ کرنا

(ص:31)

پہلے شعر میں اس امید کا اظہار کیا گیا ہے کہ عاشق فی الحال جا تو رہا ہے لیکن قوی امکان موجود ہے کہ وہ ایک دن ضرور واپس آئے گا۔ اس لیے جانِ من اپنی حویلی کا دروازہ ابھی بند نہ کرنا بلکہ کھلا ہی رکھنا کیونکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بہت جلد پلٹ آئے۔ دوسرے شعر میں سخن ور بحیثیت عاشق اپنی ترجیحات پیش کر رہا ہے کہ میری ضیافت کے لیے تمہاری ایک مسکراہٹ ہی بہت ہے۔ مجھے مٹھائی وغیرہ میں کوئی رغبت نہیں ہے۔ دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں احتیاط کا ایک پہلو بھی موجود ہے کیونکہ عہدِ حاضر میں ذیابیطس ایک عام مرض بن چکی ہے اور اس سے بچنے کے لیے میٹھے سے گریز ناگزیر ہے۔

اگلی غزل میں بھی دو اشعار حسنِ آرزو کے تناظر میں جاگزیں ہیں۔

ہے بھلی جمہوریت بھی سوقیانہ جب نہ ہو
ہم نہیں کہتے کہ ہم کو آمریت چاہیے
فن میں وسعت جس قدر ہو قابلِ تحسین ہے
اس میں ایمان و یقیں کو مرکزیت چاہیے

(ص:33)

شعر اول میں سیاسیات کے حوالے سے حسنِ آرزو پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ ہمیں جمہوریت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس میں بازاری پن نہ پایا جائے کیونکہ ہم آمریت کے حق میں ویسے بھی نہیں ہیں۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ فن یا کلام قدرت کا عطیہ ہے اور اس میں جتنی وسعت ہوگی، اتنا ہی مستحسن ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں مقصدیت ہو اور مقصدیت کی خوبی یہ ہے کہ شعر و سخن میں ایمان و یقین کو

مرکزیت حاصل ہے۔ جدید خیالات کی شاعری جو لادینی کلام پر مشتمل ہو، قابلِ قبول نہیں ہے۔ یہ اشعار بحر رمل مثمن محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔ غزل ہذا کے قوافی دشوار اور دقت طلب ہیں مگر انہیں کمال چابکدستی سے بروئے کار لایا گیا ہے۔ اسی طرح غزل کی ردیف بھی یعنی ''چاہیے'' غزل کے جملہ اشعار کو حسنِ آرزو سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

اس سے آگے ایک قطعہ لائقِ توجہ ہے۔

تمھارا خوبصورت فون نمبر
ہمارے دوست نے ہم کو دیا ہے
سنا ہے ذوق اچھا ہے تمھارا
تمھیں اپنی غزل بھیجا کریں گے

(ص:34)

قطعہ ہذا میں سخن ور ایک باذوق انسان سے مخاطب ہے کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم اچھے ذوق کے مالک ہو، چنانچہ ہم نے اپنے دوست سے آپ کا نمبر لیا ہے اور میسیج کے طور پر آپ کو اپنے خوب صورت اشعار بھیجا کریں گے۔ یہ قطعہ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔

اس سے بعد آنے والی غزل میں دو اشعار موضوع کی مناسبت سے قابلِ ذکر ہیں۔

اے خدا ہے دعا اب اٹھا لے مجھے
میں اگر سرزمیں کے لئے بار ہوں
مطلبی پن کی تہمت نہ مجھ پر لگا
میں تو دیتا سدا درسِ ایثار ہوں

(ص:35)

شعراول میں سخنور خودداری اور خودانحصاری کے حوالے سے آرزومند ہے اور دعا گو ہے کہ اے اللہ اگر میں خود اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تو اہلِ زمیں کے لیے مجھے باعثِ تکلیف نہ بنا کیونکہ میں دھرتی پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ بقول راقم:

اے میرے خدا بوجھ اگر میں ہوں زمیں پر
تو مجھ کو سنا حکمِ قضا کیوں نہیں دیتا ؟

دوسرے شعر میں شاعر اپنے مخاطب سے کہہ رہا ہے کہ تو مجھ پر خودغرضی کا الزام چسپاں نہ کر حالانکہ میرا کام تو درسِ ایثار ہے تاکہ لوگ مطلبی پن سے باز آجائیں اور ایک دوسرے کے کام آئیں۔ دراصل یہ شعر محبت کی عمومیت اور آفاقیت کا مظہر ہے۔ یہ اشعار بحر متدارک مثمن سالم میں ہیں جن کے عروضی ارکان فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہیں۔

آمدہ غزل میں حسنِ آرزو کی نسبت سے ایک شعر قابلِ توجہ ہے۔

میری جھوٹے خداؤں سے ان بن رہی
ذاتِ واحد کا فاتح پرستار ہوں

(ص:36)

شعر ہٰذا میں سخن ور اپنی توحید پرستی کا حوالہ دے رہا ہے کہ میں ایک مواحد شخص ہوں۔ اس لیے جھوٹے خداؤں سے میری نہیں بنتی بلکہ میں ان سے برسرِ پیکار رہتا ہوں۔ یہ شعر بھی محولہ بالا بحر و وزن میں کہا گیا ہے۔

غزل مابعد میں موضوع کے حوالے سے تین اشعار پائے گئے ہیں جو کچھ یوں ہیں۔

اب اشک بہائیں گے نہ ہم آہ کریں گے
ہر تیرِ ستم پر ترے ہم واہ کریں گے
کچھ دیر میں ہم اپنی انا سے تو نمٹ لیں
اے ہجر ترا قصہ بھی کوتاہ کریں گے

سوچیں گے تِرے بارے میں جب وقت ملے گا
اب فکرِ زمانہ ، نہ غمِ جاہ کریں گا

(ص:38)

مطلع ایک عزم آفریں اور رجائی نوعیت کا شعر ہے جو زبردست اٹھان رکھتا ہے۔کہا گیا ہے کہ ہم نے اب یہ بات طے کرلی ہے کہ اشک بہانا اور آہیں بھرنا چھوڑ دیں گے بلکہ محبوب کو اس کی بیداد پر خراجِ تحسین پیش کریں گے۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اے ہجر ہمیں سب سے بڑی آزمائش اپنی انا کے حوالے سے درپیش ہے۔اس لیے ہم اس سے نبردآزما ہورہے ہیں۔اس سے جونہی فراغت ملے گی، ہم تیری طرف متوجہ ہوں گے اور تیرا قصہ کوتاہ کرڈالیں گے۔یعنی تیرا خاتمہ کرڈالیں گے۔تیسرے شعر میں محبوب سے تخاطب ہے کہ اب اگر ذراسی فرصت ملی تو ہم تیرے بارے میں ضرور سوچیں گے۔دنیا کی فکر ہرگز نہ کریں گے اور اپنے جاہ ومنصب کی بھی کوئی سوچ نہ سوچیں گے۔ان اشعار کی ایک دلچسپ بات ندرتِ قوافی ہے جو عام طور پر کم ہی کہیں مشاہدہ کی جاتی ہے۔علاوہ ازیں زمانی اعتبار سے ردیف ''کریں گے'' دراصل فردائی منصوبہ بندی اور مستقبل کے بارے میں برنامج پر مشتمل ہے۔ یہ ردیف جو جمع کا صیغہ خود میں لیے ہوئے ہے، دراصل ایک اجتماعی دعوت ہے جسے ہم زمانی سوچ کا مظہر قرار دے سکتے ہیں۔ یہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ردیف ہذا قاری کو ایک اجتماعی لائحہ عمل فراہم کرتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دبستانِ دہلی کے شعراء اپنے لیے عموماً جمع کا صیغہ برتا کرتے ہیں جو ایک تہذیبی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی علامت ہے۔علاوہ ازیں اس میں ایک کاروانی انداز پایا جاتا ہے جس میں اجتماعیت و آفاقیت اور مثالیت کی بوباس رچی بسی ہوئی ہے۔

اس سے آگے والی غزل کا مقطع زیرِ غور ہے۔

کچھ اور تو رکھتے نہیں نادار ہیں فاتحؔ

ہم اپنا سخن ہی ترے ہمراہ کریں گے

(ص:39)

مقطع ہذا میں شاعر نے اپنی بے بضاعتی کا ذکر یوں کیا ہے کہ ہم اپنا قیمتی سخن تجھے نذر کر کے تیری تکریم اور ضیافت کا سامان کرتے رہیں گے۔

غزل مابعد میں چار اشعار موضوع کی مناسبت سے قابلِ ذکر ہیں۔

ہم مخلصِ ملت ہیں محافظ ہیں وطن کے
تا زندگی ہم کارِ بہی خواہ کریں گے
کل میرے سیہ خانے میں لے آئیں گے تشریف
سرکار یہ احسان بھی واللہ کریں گے
یہ کام ہے وہ کام کہ دل باز نہ آئے
ہم چاہ میں پڑ کر بھی تری چاہ کریں گے
ہم سامنے اس حور شمائل کو بٹھا کر
فاتحؔ کبھی تسخیرِ شبِ ماہ کریں گے

(ص:40)

شعر اول میں شاعر قدرِ خود ثنائی اور خود ستائی سے کام لیتے ہوئے یہ بتا رہا ہے کہ ہم ملک وقوم کے خادم ہیں اور ہم سے جتنا بن پڑے گا، بطور بہی خواہ اور مخلصِ قوم اپنی خدمات سرانجام دیتے رہیں گے۔ شعر ثانی میں شاعر محبوب سے مخاطب ہے کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ کل جناب ہمارے غریب خانے میں تشریف لانے والے ہیں، بات تو کچھ ناقابلِ یقین سی ہے۔ کیا واللہ ایسا ہی ہوگا؟ ہمارے لیے وہ ساعتِ سعید کسی عید سے کم نہیں ہوگی۔ شعر ثالث میں کہا گیا ہے کہ محبت وہ مشغلہ ہے جسے اختیار کر لیا جائے تو پھر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ آپ یقین کریں کہ اگر ہم کنویں میں بھی گر گئے تو پھر بھی تیری چاہت سے باز نہیں آئیں گے۔ ہم

کہہ سکتے ہیں کہ شعر ہذا میں لفظ ''چاہ'' کا ذوالمعنین استعمال ہے جو خوب لطف پیدا کر رہا ہے۔ دراصل فاتح جی رعایتِ لفظی سے کام لیتے ہوئے بارہا تفننِ طبع کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ شعر رابع میں کہا گیا ہے کہ ہم اپنے حورشمائل محبوب کو روبرو بٹھا کر چاندنی رات کی تقریب کا التزام کریں گے۔ یوں سمجھیں کہ ہم چاندنی رات کی تسخیر کا انتظام کریں گے۔

آمدہ غزل میں حسنِ آرزو کی نسبت سے تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس میں چاہت بھری لکیریں ہیں
تھام لے ہاتھ ہے ترے قابل
اور کوئی نہیں ہے تم جیسا
ایک تم ہی ہمیں لگے قابل
اپنے قابل سمجھ لیا ہوتا
جانا ہوتا جو آپ نے قابل

(ص:42-43)

شعر اول میں شاعر محبوب سے مخاطب ہے کہ میرے ہاتھ میں تیری چاہت کی لکیریں ہیں لہٰذا تجھے چاہیے کہ تو اسے تھام لے کیونکہ یہ ہاتھ تیرے قابل ہے۔ منطقی طور پر ہاتھ تھامنے کی ترغیب دی جا رہی ہے اور اگر وہ ہاتھ تھام لے تو اور کیا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر شاعر قربِ محبوب کے لیے پامسٹری کو بروئے کار لا رہا ہے جو ایک خاص منطقیت کی حامل ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب کی تعریف کی جا رہی ہے کہ تم جیسا حسین وشائستہ اور کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا تم ہی ہمیں اپنے قابل لگے۔ انسان تعریف وتوصیف سے خوش ہوتا ہے لہٰذا فطری طور پر محبوب کو قائل ومائل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ شعر ہذا محبت اور لگاؤ کی طرف دال ہے۔ تیسرے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ اگر ہم آپ کو واقعی لائق وفائق اور قابل لگے ہیں تو پھر آپ نے ہمیں اپنے قابل کیوں نہیں جانا؟ دراصل یہ شعر منطقی اور امکانی طور پر

جوابی رویے پر مشتمل ہے۔ یہ اشعار بحر خفیف مسدس محذوف مخبون میں کہے گئے ہیں جس کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔ یہ ایک مرکب بحر ہے۔ واضح رہے کہ بحورِ مرکبہ میں چند بحور ایسی ہیں جو آہنگ وغنائیت سے مالا مال ہیں۔ بحر ہذا کا شمار بھی انہی بحور میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد والی غزل میں موضوعاتی مناسبت سے سات اشعار محلِ نظر ہیں جو بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین ہیں۔

تیرے گلشن میں تو ہے رقصِ صبا فصلِ بہار
اپنے صحرا میں فشارِ رنگ و بو جاری رہے
ہر گلی ہر گھر میں پہنچاؤ محبت کا پیام
کاوشِ مہر و مروت کوبکو جاری رہے
ہو تواتر کا ، تسلسل کا، روارو کا گماں
خدمتِ انسانیت یوں چار سو جاری رہے
تیری آنکھیں مرتکز ہوں تیرے کارِ خاص پر
اور تیرے لب پہ وردِ اللہ ہُو جاری رہے
یہ مبارک مشغلہ ہے چھوڑنے کا تو نہیں
دہر میں اخلاص و الفت کی نمو جاری رہے
کتنے دامن چاک ہیں کتنے گریباں چاک ہیں
اے رفوگر مہرباں کارِ رفو جاری رہے
حاصلِ تہذیب ہے فاتحؔ یہ درسِ شاندار
جتنی ممکن ہو بشر کی آبرو جاری رہے

(ص:45-46)

آئندہ غزل میں موضوع کے حوالے سے تین اشعار مرقوم ہیں۔

کیسے تِری یادوں سے ، خیالوں سے ہو غفلت؟
ہے دیدہ و دل کا رخِ مرغوب ترے پاس
ہوتے ہیں بڑے شوق سے اندر سے روانہ
ہو جاتے ہیں آنسو مِرے مجذوب ترے پاس
فاتحؔ جو طرب خیز بھی ہے ہوش ربا بھی
قدرت سے ودیعت ہے وہ اسلوب ترے پاس

(ص:53)

شعراول میں محبوب سے تخاطب ہے کہ تجھے قدرت نے ایسا چہرہ مہرہ عطا فرمایا ہے جس سے ہم غافل ہو ہی نہیں سکتے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے دل کا محور تیرا چہرہ ہی ہے۔ شعر ہذا میں ایک عمیق رومانی تموج پایا جاتا ہے۔ شعر ثانی میں کہا گیا ہے کہ میرے آنسو جو دراصل دل سے نکلتے ہیں، تیرے ہاں آتے آتے یہ مجذوب یا جذب ہو جاتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شعر ہذا کتھارسز کا ایک معقول حوالہ ہے۔ تیسرا شعر جو غزل کا مقطع ہے، دراصل شاعرانہ تعلّی پر مشتمل ہے۔ کہا گیا ہے کہ فاتحؔ جی تجھے قدرت نے وہ اسلوب ودیعت کیا ہے جو طرب خیز بھی ہے اور ہوش ربا بھی ہے۔ یعنی مسرور کن ہے اور ہوش اڑا دینے والا ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے ہم اسے اسلوبیاتی تعلّی پر محمول کر سکتے ہیں۔ اگر تناسب قائم کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ یوں تو سرخیلِ تعلیات ہیں مگر اسلوبیاتی تعلیات ان کے ہاں کم اور فکری وفنی تعلیات زیادہ ہیں۔ یہ اشعار بحر ہزج مثمن مکفوف مقصور میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل ہیں۔ واضح رہے کہ عروض وضرب میں زحاف کف کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے اسے زحافِ قصر کا نام دیا جاتا ہے اور متعلقہ رکن مقصور کہلاتا ہے۔

غزل مابعد حسنِ آرزو کی نسبت سے تین اشعار کی حامل ہے جو درج ذیل ہیں۔

مِری روح بھی میری جاں بھی فدا ہے
تو جانِ غزل ہے تو جانِ وفا ہے
یہ ملبوسِ رنگیں ،یہ زلفِ معنبر
تِری دل کشی پر نچھاور صبا ہے
یہ انداز ، یہ ناز ، یہ دل ربائی
بہت خوش نظر کو تِری ہر ادا ہے

(ص:54)

پہلے شعر میں کہا گیا ہے کہ اے میرے محبوب کہ میری روح اور میری جان تجھ پر نثار ہے۔سبب یہ ہے کہ تو جانِ غزل بھی ہے اور جانِ وفا بھی ہے۔ایسی دو خوبیاں شاذ و نادر ہی کسی میں جمع ہوتی ہیں۔انہیں آپ محبوب کے پسندیدہ القابات قرار دے سکتے ہیں گویا محبوب سے اظہارِ محبت کا ایک نادر انداز ہے۔دوسرے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ تیرا رنگین لباس یا عنبر بیز زلفیں ہوں، سب تیری خوبصورتی اور گورے پن پر قربان ہیں۔ یہ شعر گہرے رومان اور جاں سپاری کی عمدہ مثال ہے۔تیسرے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ میرے محبوبِ دل نواز تجھ میں قدرت نے وہ خوبیاں رکھی ہیں جن کے باعث صبا بھی اس پر تصدق ہے۔اس میں ناز و انداز ہیں۔اس کی ادائیں دل نواز ہیں اور وہ سراپا حسن و صباحت ہے۔ شعر ہذا میں محبوب کے عشوہ و غمزہ کا بھرپور حوالہ پایا جاتا ہے۔ یہ اشعار بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن فعولن فعولن فعولن فعولن ہے۔

آگے والی غزل میں پانچ اشعار موضوع سے متعلق جھلک دکھا رہے ہیں۔

دعا دے گا یہ دیوانہ
طبیعت خوش کریں بولیں

سدا سنجیدہ رہتے ہیں
کسی دن تو ہنسیں بولیں
نہ شکوہ لب پہ لائیں گے
سنیں گے جو کہیں بولیں
کسی کو بھی نہ دیں موقع
جو خدمت ہو ہمیں بولیں
دعا دیں راستے فاتحؔ
کرم کی منزلیں بولیں

(ص:57)

التماس یہ ہے کہ اے میرے محبوب آپ بات چیت کر کے طبیعت کو راحت بخشیں۔ آپ کا یہ فقیر آپ کو دعائیں دے گا۔ معاملہ یہ ہے کہ آپ اکثر سنجیدہ رہتے ہیں۔ یا ہم اکثر سنجیدہ رہتے ہیں۔ لہٰذا شگفتہ مزاجی ایک بھلی عادت ہے۔ کبھی تو آپ ہنس بول لیا کریں۔ ہم آپ کی باتیں شوق سے سنیں گے۔ اگر آپ کچھ سخت سست بھی کہہ جائیں گے تو ہم شکوہ نہ کریں گے۔ لہٰذا جو چاہے ہم سے کہہ دیا کریں۔ ہم ہر خدمت کے لیے تیار ہیں۔ آپ ہمیں ہی حکم کیا کریں۔ کسی اور موقع نہیں ملنا چاہیے۔ فاتحؔ جی ہم ایسے مسافر ہیں جنہیں راستے دعائیں دیتے ہیں اور منازلِ کرم حیبی حیی حیی کی صدائیں دیتی ہیں۔ اگر ژرف نگاہی سے جائزہ لیا جائے تو غزل کی ردیف کی مناسبت سے فروغِ تکلم کی سعی کی گئی ہے۔ اس ردیف کے ذریعے کھل کر بولنے کی دعوت دی گئی ہے جو رسیا کے لیے سرور آگیں ہے۔ یہ اشعار بحرِ ہزج مربع سالم میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن ہے۔

غزل مابعد موضوع کے ضمن میں صرف ایک شعر کی حامل ہے۔

زمانے والوں سے اپنا کیا ہے؟

جناب کے ہیں مزاج کیسے؟

(ص:59)

شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ ہمیں زمانے والوں سے کیا مطلب ہم تو آپ کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہی اپنا حالِ دل کہیے۔ کیونکہ ہم ہی آپ کے سچے محرمِ راز ہیں۔ اس شعر میں عجز و انکسار اور وضع داری کا پہلو نمایاں ہے۔ اس شعر میں قربِ محبوب اور گریزِ اہلِ جہاں کا عالم پایا جاتا ہے۔ یہ شعر ایک مربع وزن میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعلاتن مفاعلاتن ہے۔ مربع وزن میں ایسا عمدہ اور فطری نوعیت کا شعر کہنا یقیناً فاتح جی کے کمالِ فن کی علامت ہے۔

اس سے بعد والی غزل میں حسنِ آرزو کے حوالے سے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

خیر ہو یا رب وطن کی کتنے لاپروا ہیں لوگ
اور جو لیڈر ہے ان کا کس قدر سالوس ہے!
یاسیت ہے کفر فاتح ، آس ہے اک روشنی
انقلاب آئے گا تو کیوں اس قدر مایوس ہے؟

(ص:63)

شعر اول میں شاعر بڑے دردِ دل کے ساتھ اہلِ وطن کے لیے دعائے خیر کر رہا ہے۔ ایک تو عوام لاپروا ہیں، دوسرے ان کے سیاسی لیڈر پرفریب ہیں، لہٰذا یا الٰہی خیر فرمانا، دوسرا شعر جو غزل کا مقطع ہے، اس میں شاعر خود سے مخاطب ہے کہ مایوسی کفر ہے اور امید ایک روشنی ہے۔ لہٰذا تجھے کفرِ یاس سے بچنا ہوگا اور من میں آس کی جوت جگانا ہوگی۔ اللہ سے امید ہے کہ وہ کسی انقلاب سے نوازے گا جو قوم و وطن کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ رجائیت پسندی ایک بہت اچھا رجحان ہے جو خدا کے فضل و کرم سے ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ یہاں دو فکری تلازمے موجود ہیں۔ ایک رجائیت اور دوسرا نویدِ

انقلاب ہے۔شعر ہذا میں ایک خود آموزی کا سا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ یہ اشعار بحر رمل مثمن محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں۔

اس سے بعد والی غزل میں حوالے کے چار اشعار موجود ہیں۔

کبھی ہونا تھا خوش پورا کوئی پیمان کرنا تھا
ذرا اپنی اداؤں پر ہمیں حیران کرنا تھا
بروئے کار لانا تھا کوئی عشوہ کوئی غمزہ
بپا انداز سے اپنے کوئی ہیجان کرنا تھا
وفا کا راستہ مشکل تھا ہم یہ مان لیتے ہیں
مگر اپنی ریاضت سے اسے آسان کرنا تھا
نہیں کی پیش قدمی کیوں کہیں یلغار کرنی تھی
اگر فاتح تھے تم تو سر کوئی میدان کرنا تھا

(ص:66)

شعر اول میں محبوب سے تخاطب ہے کہ آپ کو چاہیے تھا کہ خود بھی ذرا خوش ہوتے اور ہمیں بھی حیران و ششدر کرتے۔اپنا کوئی وعدہ پورا کر دیتے۔اس نیکی سے آپ کو بھی طمانیت حاصل ہوتی اور ہمیں بھی ایک خوشگوار حیرت ہوتی۔آپ کی ایسی خوب صورت ادائیں یقیناً ہمارے لیے خوشیٔ خاطر کا باعث بنیں۔شعر ثانی میں بھی محبوب کے ناز و انداز کا ذکر ہے۔ چنانچہ کہا جا رہا ہے کہ کوئی عشوہ و غمزہ دکھانا تھا اور اپنی دلکش اداؤں سے ہماری طبیعت پر ہیجان برپا کرنا تھا۔ لہٰذا یہ شعر بھی محبوب کی عشوہ طرازیوں کا تسلسل ہے۔ تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ یہ سچ ہے کہ راہِ وفا دشوار ہے اور ہم یہ بات تسلیم کر لیتے ہیں لیکن ہم چاہتے تھے کہ آپ تھوڑی ریاضت بروئے کار لا کر اس راہ کو آسان کر سکتے تھے۔ چوتھا شعر جو غزل کا مقطع بھی ہے، جس میں شاعر خود سے مخاطب ہے کہ آپ نے کہیں کوئی

پیش قدمی کیوں نہیں کی۔ اگر آپ واقعی فاتح تھے تو اسم بامسمیٰ بن جاتے اور کوئی میدان سر کر لیتے۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں حسنِ آرزو کے کئی تنوعات کارفرما ہیں کیونکہ اس میں خاصی موضوعاتی وسعت پائی جاتی ہے۔ کہیں وہ اہلِ زمانہ کو تاکید و تلقین کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں خود سے مخاطب ہو کر خود کو اچھے اچھے مشورے دیتے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ اصلاحِ جہاں کا ایک بالواسطہ انداز ہے جو انتہائی دلکش ہے۔ یہ اشعار بحر ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

اس سے اگلی غزل میں دو اشعار حسنِ آرزو کے حامل ہیں۔

ترا سراپا تری صباحت تری ادائیں سرورِ جاں ہیں
خیال میں ہے تری نفاست نگاہ میں تیری نازکی ہے
میں کس کو الزام دوں مری جاں کسے سناؤں حدیثِ امکاں
وہ کام فاتح دکھا گئی ہے نظر جو تیری جھکی جھکی ہے

(ص:68)

شعر اول میں محبوب کی خوبصورتی کا مذکور ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ اے میرے محبوب سر سے پاؤں تک ترا وجود، تیرا گورا پن اور تیری خوب صورت ادائیں راحتِ دل و جاں کا باعث ہیں۔ تیرا حسن ہر وقت نظروں میں سمایا ہوا ہے اور تیری نفاست و نزاکت ہر آن زیبِ خیال ہیں۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اے میرے دوست میں پیش آنے والے نامساعد حالات کا الزام کسے دوں اور امکانی غم و الم کا حال کسے سناؤں؟ گویا ایک طرح کی بے چارگی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ تیری جھکی جھکی سی نظریں جو بظاہر معصوم و بے ضرر سی ہیں، اپنا کام دکھا گئی ہیں۔ یہ اشعار ایک مثمن وزن میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن ہیں۔ واضح رہے کہ تا حال اس بحر کو کوئی باضابطہ نام نہیں دیا جا سکا۔ تاہم اس کا شمار بحورِ مستحدثہ میں ہوتا ہے۔ یہ ایسی بحور ہیں جن کے ارکان

دیگر بحور سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ ماقبل وزن بحر رجز دیا بحر کامل سے لیا جا سکتا ہے۔

غزل مابعد میں تین اشعار حسنِ آرزو کی نسبت سے مشمول ہیں۔

ملائی تھیں جن میں نگاہیں کسی سے
وہ لمحے بہت دیرپا ہو گئے ہیں
وہ آنکھیں اٹھیں تو قدح بن گئی ہیں
وہ گیسو اُڑے تو گھٹا ہو گئے ہیں
خدا ان سفینوں کا خود ہو محافظ
جہاں ناخدا بھی خدا ہو گئے ہیں

(ص: 69)

شعر اول میں کہا گیا ہے کہ لمحہ جو وقت کی انتہائی مختصر اکائی ہے، جب نگاہیں ملیں تو وہ لمحات بھی طویل تر ہو گئے کیونکہ دل زدوں کا زیادہ وقت عالمِ ہجراں میں گزرتا ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اس شعر میں عمیق رومانوی اور نفسیاتی وحسیاتی تاثرات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے شعر میں محبوب کی آنکھوں کا ذکر ہے جو محب کے لیے قضا کا درجہ رکھتی ہیں اور محبوب کی زلفوں کا حوالہ ہے جو گھٹا کا منظر پیش کرتی ہیں۔ لہٰذا شعر ہذا میں صنعتِ مبالغہ کا عمدہ استخدام پایا جاتا ہے۔ تیسرے شعر میں ایسے سفینوں کے لیے دعا کی گئی ہے جن کے ملاح غرور و تمکنت کے باعث خود کو خدا سمجھنے لگے ہیں۔ دراصل یہ شعر ایک تنقیدی رویہ خود میں سموئے ہوئے ہے۔ مزید برآں خدا اور ناخدا کے ملتے جلتے الفاظ بھی رعایتِ لفظی کے پہلو خود میں رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس شعر میں ایک صوری، صوتی اور سماعتی حسن پایا جاتا ہے جو خود میں ایک بھرپور غنائیت لیے ہوئے ہے۔ یہ اشعار بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ہیں۔ جن کا عروض وزن فعولن فعولن فعولن فعولن ہے۔

آمدہ غزل میں اس نوعیت کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

تاحدِ نظر کنکوے ہی کنکوے دیکھے
تو نے جو پتنگ اے مِرے ذی جاہ اڑائی
احسان ہے اس کا مِرے اخلاص پہ جس نے
یوں شوق سے دعوت مِری ہر ماہ اڑائی

(ص:70)

پہلے شعر میں میں محبوب سے تخاطب ہے کہ اے میرے عزوشرف رکھنے والے محبوب تو نے جو پتنگ اڑائی تو فضا میں تاحدِ نظر کنکوے ہی کنکوے دکھائی دینے لگے گویا تجھ میں صاحبِ ایجاد ہونے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر تیری تقلید کرنا لوگ باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ایک طرح سے یہاں بھی صنعتِ مبالغہ کا اہتمام پایا جاتا ہے۔دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ عام طور پر بڑے لوگ بمشکل ہی کسی کی دعوت قبول کرتے ہیں۔تاہم محبوبِ من تیری یہ کمال مہربانی ہے کہ تو نے ہر ماہ شوق سے میری دعوت اڑائی ہے۔گویا میرے اخلاص پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔ بہرحال اس شعر میں محبوب کی بچت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔اس طرح میزبان کے حوالے سے احساس کا فقدان بھی قابلِ غور ہے۔واضح رہے کہ متذکرہ اشعار قافیہ اور ردیف دونوں اعتبار سے نوادر کا درجہ رکھتے ہیں۔

آئندہ غزل میں بھی دو اشعار قابلِ ذکر ہیں۔

اپنا سفر ہے جاری سورج کی روشنی میں
ہے زندگی ہماری سورج کی روشنی میں
جیسے رہے اجالے پہلے بھی جزوِ ہستی
گزرے حیات ساری سورج کی روشنی میں

(ص:71)

شعراول جس کی ردیف ''سورج کی روشنی میں'' ہے،اس میں مظاہرِ فطرت کا استخدام

نچ رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ہمارا سفر سب کے سامنے ہے اور اپنی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے روشنیاں ہماری زندگی کا حصہ رہی ہیں اور اجالوں سے ہمیں خاص نسبت رہی ہے۔ یہی سچے اور کھرے لوگوں کا شیوہ ہے اور یہ دعا کی گئی ہے کہ کاش ہماری ساری زندگی اظہر من الشّمس گزرے۔ چنانچہ شعر ہذا دعائیہ اور استدعائیہ رنگ کا حامل ہے۔ یہ اشعار بحر سریع مثمن مخبون مکسوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن ہیں۔

غزل کے بعد مثنوی کی ہیئت میں ایک ترانہ رقم کیا گیا ہے جس میں ایک نئے عزم بالجزم کی بات ہے۔ ایک بھرپور دعوت ہے پیش رفت کی، نیز مہر و محبت کی، جسے ہم بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین کرتے ہیں۔

آؤ ہم ہوں نئے دور میں گامزن
گل رخانِ وطن ، عاشقانِ وطن

یہ نیا دور جو دورِ جمہور ہے
یہ نیا عہد جو عہدِ مزدور ہے

یہ نیا دور جو دورِ انصاف ہے
یہ نیا عہد جو عہدِ شفاف ہے

آؤ ہاتھوں میں ڈالے ہوئے ہاتھ ہم
کیوں نہ آغاز کر دیں یہ عہدِ کرم

یہ نیا دور جو دورِ آئین ہے
یہ نیا عہد جو عہدِ تسکین ہے

یہ نیا دور جو دورِ اخلاص ہے
یہ نیا عہد جو عہدِ حماص ہے

آؤ داخل ہوں اس دورِ خوشحال میں
آؤ شامل ہوں اس عہدِ اِجلال میں
یہ نیا دور جو فتح کا دور ہے
یہ نیا عہد جو عہدِ خوش طور ہے

(ص:72)

ترانے کے بعد والی غزل میں چار اشعار حسنِ آرزو کی نسبت سے شاملِ شذرہ ہیں۔

تمھیں ہے واسطہ مہر و وفا کا مان بھی جاؤ
مناسب اس قدر سختی نہیں ہے آزمائش میں
یہی ہے خوف تو غیروں کے کہنے میں نہ آجائے
مِرے ساقی مجھے شک تو نہیں تیری نوازش میں
دعا دی تھی مجھے دادی نے دولت مند ہونے کی
اسے کیا تھی خبر گزرے گا جیون سعی و رامش میں
سخن میں اس کے باعث رنگ آمیزی رہی فاتح
ہمیشہ خونِ دل شامل رہا اپنی نگارش میں

(ص:75)

شعر اول میں محبوب سے مہر و محبت کا واسطہ دے کر استدعا کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ آزمائش میں بہت زیادہ سختی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ شعر ثانی میں کہا گیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا ساتھی مہربان ہے لیکن یہ خوف دامن گیر ہے کہ وہ کہیں غیروں کے کہنے میں نہ آجائے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بالواسطہ طور پر آموزش و فہمائش سے کام لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ایک نفسیاتی انداز برتا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ میرے بزرگوں نے میرے دولت مند ہونے کی دعا کی تھی حالانکہ انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ اس

طرح تو زندگی دوڑ دھوپ کی نذر ہو جائے گی۔ شعر ہذا خود میں ایک اطلاعاتی پہلو رکھتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جنھیں دولت مند ہونے کا شوق ہے۔ جو لوگ دولت مندی کی آرزو رکھتے ہیں، انھیں بتایا گیا ہے کہ برنگِ سعی و رامش انھیں مشکلاتِ حیات سے گزرنا ہو گا۔ چنانچہ جادۂ منزل کا تعین کر دیا گیا ہے۔ چوتھا شعر جو غزل کا مقطع بھی ہے، اس میں شاعرانہ تعلیٰ کا ایک خوبصورت رنگ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ ہمارے اشعار میں جو رنگ آمیزی پائی جاتی ہے، وہ دراصل خونِ جگر کی سرخی کا پرتو ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم جب لکھتے ہیں تو ہمارے اشعار سرسری نہیں ہوتے بلکہ ان پر خونِ جگر صرف ہوتا ہے۔ بقول کسے:

خشک شعروں سے تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب کہیں ہوتی ہے مصرعِ تر کی صورت

گویا شاعری شاعر کی کشیدِ جاں ہوتی ہے۔ ابو البیان ظہور احمد فاتح کے شعر مذکور میں ایک لطیف انداز کا انقلابی حوالہ بھی کارفرما ہے۔ جسے بادی النظر میں محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ بنظرِ غائر اور ژرف بینی سے اس نکتہء حکمت و دانش تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جو ہر کہ و مہ کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ اشعار بحر ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

غزل بعد ازاں میں تین اشعار حسنِ آرزو کے متعلق ہیں۔

تمھیں دیکھا تو خوابیدہ تمنا جاگ اٹھے گی
صدائے رام سن لے گی تو سیتا جاگ اٹھے گی
تجھے معجز نما سمجھوں گا پھر میں اے تڑپ میری
مِرے قاتل میں جب روحِ مسیحا جاگ اٹھے گی
مجھے کامل یقیں ہے وہ سنیں گے جب سخن میرا

مِرے احباب میں فکرِ شناسا جاگ اٹھے گی

(ص:76)

پہلے شعر میں محبوب سے تخاطب ہے کہ تمہیں جونہی دیکھیں گے ہماری سوئی ہوئی آرزوئیں جاگ پڑیں گی۔جس طرح رام چندر کی آواز سن کر اس کی محبوبہ سیتا جاگ جایا کرتی تھی،اس شعر میں صنعتِ تشبیہہ اور صنعتِ تلمیح دونوں صنائع کارفرما ہیں۔یہاں سے یہ انداز لگانا مشکل نہیں کہ شاعر ہندی ادبیات سے بخوبی واقف ہے اور کہہ رہا ہے کہ تجھے میں پھر معجز نما مانوں گا کہ جب میرے قاتل میں روحِ مسیحا بیدار ہو جائے گی۔یعنی وہ مجھے تڑپانے کی بجائے میری مسیحائی کو لپکے گا۔یہاں سے یہ بات بھی عیاں ہے کہ شاعر کی نگاہ امکانات پر کس قدر بسیط ہے جسے کلام کا ایک منطقی پہلو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔تیسرے شعر میں شاعر اپنے احباب کی نسبت سخن طراز ہے اور کہہ رہا ہے کہ جب وہ میرا کلام سنیں گے، مجھے یقین ہے کہ ان میں شناساؤں کی سوچ جاگ جائے گی۔اس شعر میں پیش گوئی کے امکانات پائے جاتے ہیں۔زورِ بیاں شعری تاثیرات کا ایک حوالہ ہے۔علاوہ ازیں اس میں حسنِ تیقن بھی پایا جاتا ہے۔یہ اشعار بحر ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

آمدہ غزل نیم درجن اشعار حسنِ آرزو کے اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔جنہیں ہم بلاتبصرہ نذرِ قارئین کر رہے ہیں اور ان کا تجزیہ قارئین کی صوابدید پر منحصر ہے۔

کوئی تو آئے رفوگر کہ زخم سی جائے
ہمارے دل کی خدایا یہ بے کلی جائے
بنی ہوئی ہے جو دل کے لئے پریشانی
کسی طرح تو ہماری یہ خامشی جائے
مذاق سمجھے تھے ہم تو یہ بھید آج کھلا

وہ چاہتے ہیں یہ دیوانہ واقعی جائے
ہے اپنا مشورہ پُر زور عقل والوں کو
ضرور دل کی کہانی کبھی سنی جائے
خدا سے مانگی دعا جو نہ ہو سکی پوری
یہ کج ادائی تمھاری یہ کج روی جائے
کہیں تو فاتحؔ وہ بیٹھے کلام فرمائے
ہمارے شہر سے ہو کر نہ اجنبی جائے

(ص:80)

اسی طرح اگلی غزل بھی پیش رو غزل کا ایک تسلسل ہے اور اسی زمین میں کہی گئی ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک دوغزلے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چار متضمنہ اشعار کی حامل ہے۔

ضرور کوئی مرصع غزل کہی جائے
کمالِ فن کے تجسس میں زندگی جائے
یہ سودا مہنگا نہیں ہے ہنوز سستا ہے
تمھارے حسن پہ ہستی جو وار دی جائے
یہ عہد آج کیا جائے آدمیت سے
کسی پہ کوئی نہ تہمت کبھی دھری جائے
جتن ہزار کئے ہیں تمھارے فاتحؔ نے
یہ سرد مہری تمھاری یہ بے رخی جائے

(ص:81)

شعر اول میں زندگی کا بہترین مصرف تجویز کیا گیا ہے کہ اسے کمالِ فن کی جستجو میں بسر کرنا چاہیے اور ہر بار مرصع غزل کہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ گویا غزل کے اس مطلع

میں ایک عمدہ فنی حوالہ پایا جاتا ہے۔شعر دوم میں شاعر محبوب سے مخاطب ہے کہ اگر زندگی تیرے حسن پر قربان ہو جائے تو یہ سودا چنداں مہنگا نہیں ہے بلکہ ہنوز ارزاں ہے۔یوں لگتا ہے کہ شعر ہذا میں شاعر کی عمیق رومانویت انتہاؤں کو چھونے لگی ہے۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شاعر سے بڑھ کر محبت کا رسیا شاذ ہی کوئی ہوتا ہے۔شعر سوم میں حسنِ تہذیب کا قرینہ سکھایا جا رہا ہے۔چنانچہ کہا گیا ہے کہ آدمیت سے آج یہ عہد کرنا چاہیے کہ کبھی کسی پر بہتان طرازی نہ کی جائے گویا اخلاقی آدرش کی شعر ہذا میں آموزش کی گئی ہے۔چوتھا شعر جو غزل کا مقطع ہے،اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کے فاتح جی کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ کسی طرح آپ کی حیات سے سرد مہری اور بے رخی جیسے منفی رجحانات کی نفی ہو جائے۔یہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قافیے اور ردیف کا ماہرانہ امتزاج ایک لطفِ خاص پیدا کر رہا ہے جو یقیناً ندرت و جودت کا حامل ہے۔ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قافیہ اور ردیف کی بندش ایک دلکش فضا پیدا کر رہی ہے جسے ہم لطیف کلائمکس بھی کہتے ہیں۔

بعد ازاں ایک نظم بعنوان ''مرکزِ نگاہ'' سامنے آتی ہے جو نظمِ معریٰ کی ہیئت میں رقم کی گئی ہے۔

شیر جیسے تاڑتا ہے ایک جاہ
اس پہ ہی مرکوز رکھتا ہے نگاہ
دوڑتا ہے اس کو پانے کے لئے
بے خبر ہو کر جوار و قرب سے
کر نہیں لیتا اسے جب تک شکار
ایک پل ملتا نہیں اس کو قرار
ہے مشابہ اس سے اپنا حال بھی
ایک ہستی پر نظر مرکوز ہے

مضطرب ہیں اس کو پانے کے لئے

(ص:87)

نظم ہذا میں محبت اور شکار کے خواص کو یکجا کر کے ایک گونہ شدت پیدا کر دی گئی ہے۔ جس طرح شیر شکار کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک عاشق بھی قربِ محبوب کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ دونوں میں مرکزِ نگاہ کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کے حصول کے لیے سرتوڑ کوشش کی جاتی ہے۔ گویا ایک تمثیلی فضا پیدا کر کے معاملے کو ایک زبردست ڈرامائی رنگ دے دیا گیا ہے۔ نظم ہذا بحر رمل مسدس محذوف میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

اگلی غزل میں اکلوتا شعر حسنِ آرزو کا آئینہ دار ہے۔

جس سے ٹوٹا ہو آبگینۂ دل
ہم سے ایسی خطا کبھی نہ ہوئی

(ص:88)

اس شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم سے یہ جرم کبھی صادر نہیں ہوا کہ ہم نے دل کے آبگینے کو نہ توڑا بلکہ ہمیشہ دلوں کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

آمدہ غزل میں اس نوعیت کے تین اشعار دیکھے جا سکتے ہیں۔

تیری یادوں کو جو مہمان بنا رکھا ہے
وادیٔ دل کو پرستان بنا رکھا ہے
دیکھ تو اے دُرِ شہوار مری عظمتِ عشق
خود کو میں نے ترے شایان بنا رکھا ہے
خواہشِ وصل ہے یا دردِ جدائی یارب
جس نے بے کل مجھے ہر آن بنا رکھا ہے

(ص:90)

پہلے شعر میں شاعر نے محبوب سے مخاطب ہو کر یہ کہا ہے کہ میں نے دل کی وادی میں تیری یادوں کو مہمان بنایا ہوا ہے۔ گویا میں نے دل کی وادی کو باغ بنایا ہوا ہے جس میں تیری یادوں کے پھول کھلے ہیں۔ اس شعر میں گہری رومانویت اور منظر نگاری کی فضا پائی جاتی ہے۔ چونکہ محبوب کی یادیں ہمیشہ عاشق کو پیاری ہوتی ہیں اور وہ انہیں عزیزِ جاں رکھتا ہے، اسے یادِ حسین کا مجسم و مجرد حوالہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب سے تخاطب ہے چنانچہ محبوب سے کہا گیا ہے کہ اے شاہوں کے لائق موتی ذرا میری عظمتِ عشق ملاحظہ ہو کہ میں نے کوشش کر کے خود کو تیرے شایانِ شان بنا لیا ہے تا کہ کوئی تجھے میری بے بضاعتی یا اوقات کا طعنہ نہ دے سکے۔ بقول راقم:

جس کی خواہش کی اسے حاصل کیا
ہم نے خود کو اس قدر قابل کیا

تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ ایک خلش ہے جو مجھے ہر لمحہ بے چین رکھتی ہے۔ مجھ سے اس کا تعین نہیں ہو رہا کہ یہ وصال کی تمنا ہے یا رنجِ ہجراں ہے۔ چنانچہ ایک غیر یقینی صورتِ حال پائی جاتی ہے جو نا قابلِ فہم ثابت ہو رہی ہے۔

غزل مابعد میں بھی حسنِ آرزو کے تناظر میں تین اشعار کہے گئے ہیں۔

ہم بھی وفا میں حضرتِ رانجھا سے کم نہیں
تم بھی خلوص پیدا کرو ہیر کی طرح

بیٹھیں گے تھوڑی دیر تری بزمِ ناز میں
چلتے بنیں گے پھر کسی رہگیر کی طرح

فاتحؔ ترا کلام بھی ہے ترجمانِ دل
تو بھی رہینِ درد و غم ہے میرؔ کی طرح

(ص:92)

پہلے شعر میں ایک تقابلی فضا پائی جاتی ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ ہم بھی وفا میں رانجھے سے کم نہیں ہیں۔ وہ بھی ایک سچا عاشق تھا اور اب ہمارا بھی یہی حال ہے۔ لہٰذا اے میرے محبوب تمہیں بھی چاہیے کہ جیسے ہیر مخلص تھی، اسی طرح تم میرے ساتھ پورے طور پر مخلص بن کے رہو۔ یہ شعر معروف لوک داستان ہیر رانجھے کی دوہری تلمیح کا حامل ہے۔ جسے ایک بھرپور اساطیری حوالہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے شعر میں ایک اظہارِ عجز ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ ہم تھوڑی دیر تیری بزمِ ناز میں بیٹھیں گے، بارِ خاطر نہ ہو، جلد ہی کسی مسافر کی طرح چلتے بنیں گے۔ گویا اس شعر میں محبوب کی طمانیتِ طبع کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ تیسرا شعر جو غزل کے مقطع پر مشتمل ہے، اس میں بھی خود شناسی یا عرفانِ ذات اور شاعرانہ تعلّی کا ماحول پایا جاتا ہے۔ شاعر خود سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ تیرا کلام دلوں کی ترجمانی کرتا ہے کیونکہ میر تقی میر کی طرح تیری زندگی بھی رنج والم سے عبارت ہے۔ گویا میرؔ کی ادبی تلمیح یہاں صنعتِ تلمیح کا کام دے رہی ہے اور اس کی محرومیوں کا ایک بھرپور حوالہ ہے۔ مجموعی طور پر یہ شعر داخلی اظہار کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس سے بعد والی غزل حسنِ آرزو کے اشعار سے معمور ہے جس میں سات اشعار اس حوالے سے پائے جاتے ہیں۔ یہ اشعار سادگی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ لہٰذا بلا تبصرہ نذرِ قارئین ہیں۔

یوں مرے ذوقِ محبت کو ملا تیرا جمال
جیسے تشنہ لب کو وسطِ دشت میں پانی ملے
اب نہیں کوئی شکایت کاتبِ تقدیر سے
کتنا خوش قسمت ہے جس کو آپ سا ساتھی ملے
چل دیے تھے تو لگا تھا جیسے مدت ہو گئی

آ گئے ہو تو ہوا محسوس تم جلدی ملے
یوں نہ ہو ہم توڑ بیٹھیں شیشہ و جام و سبو
جلد ہی صہبائے آتش رنگ اے ساقی ملے
تیری خاطر دہر سے بیگانہ ہو سکتا ہوں میں
مجھ کو تیری ذات میں دنیا کی ہر خوبی ملے
تلخیٔ ایام کا یارب اثر ہو کچھ تو کم
کچھ تو کیف انگیز راحت ، پُر سکوں مستی ملے
ہو لقائے یار حاصل ، پھر تو فاتحؔ غم نہیں
چاہے بدلے میں زمانے بھر کی بے مہری ملے

(ص:93-94)

اس طرح اس سے اگلی غزل میں بھی حسنِ آرزو کی نسبت سے پانچ اشعار موجود ہیں۔

تو کتنے پیارے تحفے اے گل عذار لایا
آنکھوں کا نور لایا ، دل کا قرار لایا
جو شخص میرا گلشن ویران کر گیا تھا
خود ہی وہ آج اِس میں فصلِ بہار لایا
آنا نہ چاہتے تھے ہم انجمن میں تیری
پر جذبۂ محبت بے اختیار لایا
پوچھے اگر زمانہ تو صاف صاف کہنا
نذرانۂ دل و جاں یہ جاں نثار لایا
لاکھوں برس کے قدسی کرتے ہیں رشک مجھ پر
دو روزہ زیست کو میں یوں روبکار لایا

(ص:95-96)

شعراول میں محبوب سے تخاطب ہے کہ اے پھولوں کے رخسار والے تو اپنے ساتھ کیا کیا سوغاتیں لایا ہے۔ تیرے دیدار سے آنکھوں کو تازگی ملی ہے اور دل نے سکون پایا ہے۔ یہ سب تیری آمد کے انعامات ہیں۔ ظاہر ہے یہ شعر خود میں رجاوطرب کی بھرپور کیفیات رکھتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو معاصر شاعری میں ایسے استشہادات شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایسے اشعار شاعری کی ساکھ کو برقرار رکھنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مزید برآں ان سے یاسیت وقنوطیت کی تیرگی کو کم کرنے میں کافی وشافی مدد ملتی ہے۔ دوسرا شعر محبوب سے شکوے اور اس کی عنایت کا تذکرہ ہے کہ وہ شخص جو میرا گلشن برباد کر گیا تھا، آج وہ اس میں خود ہی فصلِ بہار لے آیا ہے۔ گویا شعر ہذا محبوب کے دوہرے رویے کی طرف مشیر ہے۔ اس شعر میں صنعت مراۃ النظیر کی جلوہ نمائی بہاریہ شاعری کی یاد تازہ کرتی ہے۔ جیسے گلشن اور فصلِ بہار وغیرہ۔ تیسرا شعر عجز و محبت کا آئینہ دار ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم محفلِ یار میں آنے سے گریزاں تھے کیونکہ ناہموار برتاؤ کا اندیشہ تھا لیکن خیر ہو جذبۂ دل کی کہ یہ کھینچ کر یہاں تک لے آیا۔ بالفاظِ دیگر محبت میں بے اختیاری کا پہلو عیاں کرتا ہے جسے آپ خرد کی نفی قرار دے سکتے ہیں۔ گویا معاملاتِ عشق میں حضرتِ دل کو بالادستی حاصل ہے۔ چوتھے شعر میں شاعر محبوب کو مشورہ دے رہا ہے کہ اگر کوئی پوچھے کہ تیرا عاشق زار تیری خدمت میں پیش کرنے کے لیے کیا سوغات لایا ہے تو برجستہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دل و جان کے نذرانے تیرے حضور پیش کرنے کے لیے لایا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک وافر داخلی اظہار اور ایک بھرپور رومانوی بے باکی اس شعر میں اپنا رنگ جما رہی ہے۔ یہاں ایک پہلو جاں سپاری کا بھی نمایاں ہے۔ پانچویں شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ فرشتے جو لاکھوں برس عبادت میں گزار چکے ہیں، میری دو روزہ زندگی پر رشک کرتے ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ میں نے عمرِ دو روزہ کو ایسے

خلوصِ عبادت میں بسر کیا ہے کہ لائقِ رشک ٹھہری ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شعر ہذا میں وقت کے ایک عمدہ اور معقول ترین مصرف پر روشنی پڑتی ہے جس میں صنعتِ مبالغہ کا شاندار استخدام پایا جاتا ہے۔ گویا وہی کیفیت ہے۔

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

یہ اشعار بحر سریع مثمن مخبون مکسوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن ہے۔ اگلی غزل میں دو شعر بحوالہ حسنِ آرزو موجود ہیں۔

انجانی سی اک مستی ہے شام و سحر چھائی
ہر چند کہ ہاتھوں میں ساغر ہے نہ پیمانہ
ایسے میں نہ کیوں دل میں میلا ہو امنگوں کا؟
جوبن پہ جوانی ہے ، موسم بھی ہے مستانہ

(ص:98)

شعر اول میں ایک انجانی سی مستی کا ذکر ہے جو ہمہ وقت طاری ہے۔ حالانکہ ہاتھ میں ساغرِ مے بھی نہیں ہے۔ غالباً یہ مستی عشق و محبت کی سرشاری ہے جو بنا پیے طاری ہے۔ اگرچہ شعر ہذا غیر خمریاتی ہے، پھر بھی باعتبار صنعتِ مراۃ النظیر ایک خمریاتی شعر محسوس ہوتا ہے۔ جس میں ایک لطیف سا گریز کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ شعر ثانی ماحول کی سرمستی کا بھرپور حوالہ ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ شباب جوبن پر ہے اور موسم بھی مستانہ ہے۔ ایسے میں دل میں آرزوؤں کے میلے کیوں نہ لگیں۔ امنگوں کے رقص کیسے نہ ہوں اور اس سرمستی میں انسان کیوں نہ رنگا ہوا محسوس ہو۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو دونوں اشعار میں ایک تسلسل کی فضا پائی جاتی ہے۔ مزید برآں ان میں ایک غیر محسوس طربیہ حوالہ بھی محسوس ہوتا ہے۔ اس مشینی دور میں جبکہ ہر طرف افکار و آلام کے بادل چھائے ہوئے ہیں، سرور آگیں

کلام کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ایسا کلام یقیناً قارئین کے لیے خوانِ یغمہ کا درجہ رکھتا ہے۔غزل مابعد حسنِ آرزو کے تین اشعار سے مملو ہے۔

تصور میں رخِ زیبا ہے تیرا
نگاہوں میں فروزاں قمقمے ہیں
تبسم تیرا فردوسِ نظر ہے
بہشتِ گوش تیرے زمزمے ہیں
ہمارے شعر فاتح درحقیقت
کتابِ دل کے سادہ ترجمے ہیں

(ص:99)

پہلے شعر میں محبوب سے تخاطب ہے۔کہا گیا ہے کہ تصور میں تیری زیبائی بس چکی ہے۔جیسے نگاہوں کے سامنے قمقمے روشن ہوں۔شعر ہذا میں استعاراتی فضا پائی جاتی ہے اور بھرپور تصوارتی کیفیت کارفرما ہے۔شعر ثانی میں بھی جوڑی استعارات کی لائی گئی ہے۔محبوب کی تحسین یوں کی گئی ہے کہ تمہاری مسکراہٹ ایسی دل نشیں ہے جیسے نظر کے سامنے جنت آگئی ہو اور تمہاری گنگناہٹ ایسی دل نشیں ہے جیسے کانوں میں بہشت کی آوازیں آ رہی ہوں۔یہ توصیفِ محبوب کا ایک دلنشیں انداز ہے۔چنانچہ صنعتِ مبالغہ سے اس سلسلے میں بہت خوب کام لیا گیا ہے۔شعر ثالث جو غزل کا مقطع ہے،اس میں بڑی عجیب بات کی گئی ہے۔چنانچہ کہا گیا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے خوبصورت اشعار درحقیقت کتابِ حیات کے سادگی آمیز ترجمے ہیں جن کی مدد سے زندگی پرکشش محسوس ہوتی ہے۔ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شعر ہذا قدرِ ذات کا ایک بھرپور حوالہ ہے۔جس میں اپنے کلام کی مثبت تنقیدی ستائش کی گئی ہے۔یہ اشعار بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

آمدہ غزل میں حسنِ آرزو کے حامل سات اشعار قوسِ قزح کے رنگ لیے ہوئے ہیں جو بلاتبصرہ ہدیہءقارئین ہیں۔

تِرے روئے نظر افروز پر چندا کو رشک آئے
نشیلی انکھڑیوں پر ساغرِ صہبا کو رشک آئے
حجاب آئے تِرے انداز کی شوخی سے بجلی کو
تِرے حسن و نزاکت پر گلِ رعنا کو رشک آئے
خجل کر دیتی ہے مشعل کو تیری جلوہ سامانی
تِری تمکین پر ہر انجمن آرا کو رشک آئے
تِرا بیمار ہو جاتا ہے تجھ کو دیکھ کر اچھا
مسیحائی پہ تیری حضرتِ عیسیٰ کو رشک آئے
ملا ہے تجھ سا یکتائے جہاں محبوب جب مجھ کو
مِری اِس خوش نصیبی پر نہ کیوں دنیا کو رشک آئے؟
فروزاں میرے دل میں اس طرح شمعِ محبت ہے
کہ ضو باشی پہ اس کی وادیٔ سینا کو رشک آئے
قلم برداشتہ لکھتا ہے اِس انداز میں فاتحؔ
کہ اِس کی تندیٔ تحریر پر دریا کو رشک آئے

(ص:100)

اس کے بعد آنے والی سالم غزل موضوع سے مناسبت رکھتی ہے۔

ہر حسیں چیز میں ہم تیری شباہت دیکھیں
چاند سورج سے فزوں تجھ میں وجاہت دیکھیں
ہم ہیں شہ زور اگر دیکھیں امنگیں دل کی

ضعف طاری ہے اگر اپنی نقاہت دیکھیں
جن کو شکوہ ہے ، نہیں پیار جہاں میں باقی
اُن سے کہہ دو مِری الفت ، مِری چاہت دیکھیں
کچھ دفینوں کے امیں ہوتے ہیں کھنڈر اکثر
مت فقیروں کو باندازِ کراہت دیکھیں
عقل والوں کو جو دیوانہ بنا دیتا ہے
آؤ اُس فاتحؔ دانش کی سفاہت دیکھیں

(ص:101)

اس میں محبوب سے کہا گیا ہے کہ جو چیز بھی خوب صورت دکھائی دیتی ہے،اس میں تیرا عکسِ جمال نظر آتا ہے۔ تجھ میں چاند سورج سے بڑھ کر حسن پایا جاتا ہے۔مظاہرِ فطرت پر حسنِ جاناں کو برتری دی گئی ہے۔ یہ بھی صنعتِ مبالغہ کا ایک خوب صورت انداز ہے۔اس شعر کو معرفت ومجاز دونوں حوالوں پر محمول کر سکتے ہیں۔اگر دل کی امنگوں کے حوالے سے ہم اپنا جائزہ لیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہم سے بڑا شہ زور اور کوئی نہیں لیکن اگر اپنی کمزوری کو مدنظر رکھ کر جائزہ لیں تو یوں محسوس ہو کہ ہم پر ایک گونہ ضعف طاری ہے۔اس میں دو فکری تلازمے ہیں جو یقیناً منفرد ومتنوع ہیں۔وہ لوگ جو گلہ گزار ہیں کہ زمانے میں محبت کا قحط پڑ چکا ہے،انہیں میری طرف بھیجیں، مجھ سے مل کر انہیں اندازہ ہوگا کہ محبت کے کتنے سرچشمے ہنوز پائے جاتے ہیں۔عصری حوالے سے یہ رویہ مطلب پرستی اور خودغرضی کے رجحانات کی بھی نفی کرتا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ عموماً کھنڈرات میں نوادر پائے جاتے ہیں۔لہٰذا اہلِ دنیا ہم فقیروں کو بھی نفرت سے نہ دیکھیں بلکہ انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اپنے فقر کے باوجود بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ یہاں رازداری کا ایک پہلو پایا جاتا ہے جو فطری نوعیت کا حامل ہے۔مقطع میں کہا گیا ہے کہ فاتحؔ نے بڑے عاقلوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے حالانکہ خود اس

میں دیوانگی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔لیکن اسے یہ تفوق حاصل ہے کہ وہ فاتح دانش ہے،علم سے بڑی گہری نسبت رکھتا ہےاورادب کا ایک بڑاشہسوار ہے۔گویا مقطع دوہری مگر متضاد خصوصیات کے تناظرات کا حامل ہے۔یہ غزل بحر رمل مثمن محذوف مخبون میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فعلن ہیں۔یہ ایک اختراعی نوعیت کا وزن ہے جو بہت ہی کم مستعمل ہے۔

اس کے بعد ایک نظم بعنوان''رات کے بارہ بجے'' مرقوم ہے جو مثلث کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔جس میں حسنِ آرزو کے نرالے مظاہر پائے جاتے ہیں۔نظم ہذا ہیئت کے اعتبار سے گیت سے مشابہت رکھتی ہے۔

رات کے بارہ بجے ہیں ، سو رہی ہے کائنات
ثبت ہے مُہرِ سکوت ایسے میں ہر آواز پر
میں لگاتا ہوں مگر مضراب دل کے ساز پر
آ رہی ہے رقصاں رقصاں تیری یادوں کی برأت
تیری یادیں ہیں تِری صورت ہی دلدار و حسیں
تجھ سے بڑھ کر باوفا ، تجھ سے زیادہ دلنشیں
جن سے ہے اک انجمن تنہائی میں بھی میری ذات
وہ حسیں یادیں جنھیں میں زیست کا حاصل کہوں
وہ حسیں یادیں جنھیں گلہائے باغِ دل کہوں
وہ حسیں یادیں غزل خواں جن سے ہے روحِ حیات
یادیں جو ہیں وصل کے رنگیں مناظر کی امیں
یادیں جو ہیں تیرے وعدوں کے جواہر کی امیں
بند ہے ان کے عجائب خانے میں اک ایک بات

لذتِ رخسار و لب پوشیدہ ان یادوں میں ہے
شعلۂ ناز و ادا رقصیدہ ان یادوں میں ہے
ہے انھی کے فیض سے آباد تنہائی کی رات
بزمِ دل آراستہ اب بھی کئے بیٹھا ہوں میں
تجھ کو آغوشِ تصور میں لئے بیٹھا ہوں میں
اور تو ہے کہ نہیں کرتا نگاہِ التفات
گھپ اندھیرا ہے تو کیا، روشن ہیں دیپ افکار کے
پھول تازہ ہیں خزاں میں بھی مِرے اشعار کے
ہے دلِ بیدار و زندہ کو سدا حاصل ثبات

(ص:102-103)

نظم کا پہلا حصہ نصف شب کی منظر نگاری ہے جس کی حیثیت تمہید وتشبیب سے ملتی جلتی ہے۔ ہر طرف خاموشی ہے مگر شاعر ایسے میں سازِ دل پر زخمہ لگا رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یادِ جاناں کی بارات کی آمد آمد ہو، محبوب کی یادیں بھی مثلِ محبوب دلدار وحسیں ہوتی ہیں بلکہ کہیں کہیں وفا وکشش میں محبوب سے بڑھ جاتی ہیں جن کے باعث میری تنہائی میں بھی محفل کا سماں ہے۔ یہاں تخیلاتی کرشمہ کاری عروج پر نظر آتی ہے۔ یہ خوبصورت یادیں زندگی کا حاصل ہیں بلکہ باغِ دل کے رنگا رنگ پھول ہیں۔ یادیں ایسی حسیں ہیں کہ جن کے دم سے روحِ حیات غزل خواں محسوس ہوتی ہے۔ دراصل یہ بند بہار یہ شاعری کا غماز ہے۔ مجموعی طور پر نظم ہذا رجائی اور طربیہ عناصر پر مشتمل ہے۔ یار کی یادیں وصل کے رنگین مناظر دل میں رکھتی ہیں اور نادر جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ ہر دلکش بات یار کی یادوں کے عجائب خانے میں محفوظ و مامون ہے۔ ان یادوں میں لب ورخسار کی لذت چھپی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں سواطعِ ناز وادا ان میں رقصاں ہے اور شبِ تنہائی ان کے فیض سے گنج

معانی بنی ہوئی ہے۔ گویا یہ بند لکھنوی رومانویت کا حامل ہے۔ ایک عجیب وغریب تصوراتی فضا ہے۔ دل کی محفل آراستہ ہے اور محبوب تصورِ آغوش میں آچکا ہے اور محبوب کی دلبری کا یہ عالم ہے کہ وہ نگاہِ التفات بھی نہیں کر رہا۔ حالات نامساعد سہی، گھپ اندھیرے میں اشعار کے دیپ روشن ہیں، اگر عہدِ خزاں ہے تو پروا نہیں، تو ایسے میں ہم نے اپنے اشعار کے پھول کھلائے ہوئے ہیں جو مشامِ جاں کو معطر کر رہے ہیں۔ اگر دل بیدار اور زندہ ہے وا سے درجہء ہمیشگی حاصل ہے یعنی وہ حیاتِ جاوداں کا حامل ہے۔ نظم ہذا جو تصوراتی اعماق خود میں لیے ہوئے ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ طلسماتی آفاق کو چھو رہی ہے۔ غزل ہذا بحر رمل مثمن مقصور میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ فاعلان ہیں۔

اس نظم کے بعد ''دعا'' سے معنون ایک اور نظم سراپا حسنِ آرزو ہے جو غیر مردف غزل کی ہیئت میں مرقوم ہے۔ اس میں نادر و مشکل قوافی بروئے کار لائے گئے ہیں جو عربی لسانی مزاج کے حامل ہیں۔ یہ نظم بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین کی جاتی ہے جس کا تبصرہ قارئین کی صوابدید پر منحصر ہے۔

اے بارِ خدا ہم کو عطا کر دے یہ توفیق
باطل کے مقابل بنیں، حق کی کریں تصدیق
پھر جرأتِ فاروقؓ عطا کر ہمیں یارب
پھر بخش ہمیں زورِ علیؓ ، جذبۂ صدیقؓ
گمراہی نے دنیا کو بنا رکھا ہے دوزخ
ہے منتظرِ بندۂ حق عالمِ زندیق
ہم دنیا کو اخلاص و محبت کا سبق دیں
مٹ جائے یہ نسل و وطن و رنگ کی تفریق
ہر شخص نظر آئے سدا محوِ عبادت

بیٹھے دلِ انسان میں یوں مقصدِ تخلیق
پیمانۂ ہستی کروں اس طرح میں لبریز
ہو حسنِ عمل سے مِرے ایمان کی توثیق
میں مانگتا ہوں صرف تِری ذات سے یارب
بھر دے زرِ رحمت سے مِرا دامنِ ابریق

(ص:104)

اس کے بعد ایک گیت شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ گیت کی ایک مخصوص ہیئت ہوتی ہے جس کے باعث وہ ہر دلعزیز ٹھہرتا ہے۔ دراصل اس میں ہیئتی پسندیدگی کا ایک عوامی عنصر پایا جاتا ہے۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح گیت بہت کم لکھتے ہیں لیکن اس صنف سے ان کا کلام خالی نہیں ہے۔ ان کا ایک گیت زیبِ قرطاس ہے۔

ملن رت آ گئی ہے ابر چھائے ہیں چلے آؤ
صبا نے پھول گلشن میں کھلائے ہیں چلے آؤ
چلے آؤ کہ چنچل سی بہاریں رقص کرتی ہیں
ہوائیں گنگناتی ہیں ، پھواریں رقص کرتی ہیں
سمے وعدے وفا کرنے کے آئے ہیں چلے آؤ
مسرت سے درختوں پر پرندے چہچہاتے ہیں
ہرن اٹھکیلیاں کرتے ، پپیہے گیت گاتے ہیں
امنگیں دل میں میلا سا لگائے ہیں چلے آؤ
حسیں شام و سحر ہے اور راتیں بھی نشیلی ہیں
ہماری پلکیں اشکوں سے مگر ہر وقت گیلی ہیں
دیے امید کے دل میں جلائے ہیں چلے آؤ

خدا کا واسطہ ہے اے سجن یہ بے رخی چھوڑو
نہ اتنے سنگ دل بن کر ہمارا نرم دل توڑو
تمھاری راہ میں آنکھیں بچھائے ہیں چلے آؤ

(ص:105)

اس گیت میں منظر نگاری اور بہار یہ کیفیات ہیں۔محبوب کو بلاوا بھیجا جا رہا ہے کہ ملنے کے موسم آ گئے ہیں۔مناظر دلکش ہو گئے ہیں۔ بہاریں پورے جوبن پر نظر آتی ہیں۔دل میں امنگیں میلہ لگائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تمہیں بھی آنا چاہیے تا کہ ہم شربتِ وصال کے مزے لوٹ سکیں۔موسم کا احترام ہو جائے۔مناظر کی قدر افزائی ہو جائے۔آرزوؤں کا پالن ہو جائے۔ گیت چونکہ ہندی صنفِ سخن ہے، لہٰذا ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے اس میں ہندی لفظیات کی سندرتا اور کوملتا کا بھی باضابطہ اہتمام کیا ہے۔ گیت کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں مرد مقامِ محبوبیت میں چلا جاتا ہے جبکہ عورت منازلِ عشق پر فائز ہو جاتی ہے۔ گیت کی ردیف ''چلے آؤ'' ایک بھرپور کیفیتِ اشتیاق ہے۔یعنی محب محبوب سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔ چنانچہ اس ردیف کے باعث گیت کی معنوی چاشنی اور رومانویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ گیت بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

اس کے بعد ایک اور گیت سامنے آتا ہے جسے نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔

سجن جس روز آئیں گے
بہاریں ساتھ لائیں گے
خوشی سے منوا بہکے گا
چمن خوشبو سے مہکے گا
پرندے چہچہائیں گے

مقدر مہرباں ہو گا
حسیں بے حد سماں ہو گا
نظارے مسکرائیں گے
ہمیں ملتا جو دیکھیں گے
ستارے خوب ناچیں گے
سبھی غم بھول جائیں گے
شبِ مہ ہو گی جوبن پر
سبھی سکھیوں سے ہم مل کر
خوشی کے گیت گائیں گے
سجن جس روز آئیں گے

(ص:106)

اس گیت میں ایک تصور باندھا گیا ہے کہ عنقریب آمدِ جاناں متوقع ہے اور اس کے آتے ہی سماں بدل جائے گا۔ مناظر دلکش ہو جائیں گے۔ بہاریں گلشن میں رقص کناں ہوں گی۔ گل کھلیں گے۔ کلیاں مہکیں گی اور امنگیں جوبن پر نظر آئیں گی۔ مقدر مہربان ہوگا۔ مناظرِ فطرت پوری دلکشی سے جلوہ گر ہوں گے۔ ستارے جھلملائیں گے۔ چاندنی چاندی کا فرش بچھائے گی۔ ہر طرف نغماتِ طرب ہوں گے۔ بادل گھر کر آئیں گے۔ بادو باراں کی دل آویز کیفیت ہوگی۔ گویا یہ گیت رومانویت ومسرت کا نمائندہ ہے جو انسان کو سرشار کر دیتی ہے۔ اس گیت کی بدولت زندگی جواں نظر آتی ہے اور عاشق نہال نظر آتا ہے۔ حزن وغم و یاس کے سبب شاعری کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا، یہ طرب آمیز گیت اس کا شاندار ازالہ کرتا ہے۔ یہ گیت محولہ بالا بحر کے مربع وزن میں کہا گیا ہے۔

گیتوں کے بعد حمدِ ربِ جلیل نمایاں ہے جس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن

سے فکر کا کوئی پہلو بھی محو نہیں ہوتا۔ حمد ہذا غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے جو عصرِ حاضر میں نظم کی مقبول ترین ہیئت ہے۔ اس حمد کو بلا تبصرہ ہدیہء قارئین کیا جاتا ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ قارئین کو بھی اپنی صوابدید کا مکمل اختیار حاصل ہے۔

تِری توحید پہ رکھتا ہوں میں ایمان یا اللہ
ہے تیری کبریائی کا مجھے ایقان یا اللہ
زمین و آسماں ، لوح و قلم ، عرش و دگر عالم
کیے تخلیق تو نے ہی ہمہ گیہان یا اللہ
تِرے انوار سے روشن ہیں سورج ، چاند اور تارے
مہکتے ہیں تِری خوشبوؤں سے بستان یا اللہ
تو قادر ہے ، تو پالن ہار ہے ، تو بخشنے والا
میں ہوں کمزور سا ، خاطی سا اک انسان یا اللہ
نہایت مہرباں ہے تو سکونِ عاشقاں ہے تو
تِرے صدقے ، مِرا دل ، میری جاں قربان یا اللہ
تِری بخشش ، تِرے لطف و کرم کی کوئی حد بھی ہے
گنے جائیں بھلا کیسے تِرے احسان یا اللہ
تِری حمد و ثنا میں رات دن مصروف رہتے ہیں
یہ پتھر ، یہ شجر ، یہ خوش نوا مرغان یا اللہ
کمی آ ہی نہیں سکتی کبھی تیرے خزانوں میں
ازل سے کارفرماں ہے تِرا فیضان یا اللہ
مجھے جاں سے بھی پیارا ہے تِرا پیغمبرِ عربیؐ
مِری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تِرا قرآن یا اللہ

مِری اِس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو گی؟
فدا ہو راہ میں تیری جو میری جان یا اللہ
سمندر سب دواتیں اور شجر اقلام بن جائیں
بیاں پھر بھی نہ ہو پائے گی تیری شان یا اللہ
تو اعلیٰ ہے مِری کوتاہیوں سے درگزر فرما
کہ میری عقل ناقص ہے ، میں ہوں نادان یا اللہ
بھٹکتا پھر رہا ہوں میں کٹھن پُر پیچ راہوں پر
عطا کر مجھ کو سیدھی راہ کی پہچان یا اللہ
مجھے محفوظ رکھ تاریکیٔ کفر و جہالت سے
مِرے پاؤں نہ پھسلا دے کوئی طوفان یا اللہ
مدد فرما مِری بچتا رہوں میں ہر برائی سے
سدا نیکی کی جانب ہو مِرا میلان یا اللہ
مِرے دل میں تِری یادِ حسیں باقی رہے ہر دم
اگر خود سے بھی ہو جائے مجھے نسیان یا اللہ
ادا ہو کچھ تو حق تیری نوازش ہائے پیہم کا
رہے فاتحؔ سدا تیرا ہی مدحت خوان یا اللہ

(ص:107-108)

جہاں سخنورِ عشقِ جاناں میں مستغرق ہے، وہاں حبِ الٰہی پورے تموج کے ساتھ اس کے قلب میں موجزن ہے۔ گویا معرفت و مجاز کے تلازمے پہلو بہ پہلو چلا کرتے ہیں۔ شعری حوالے سے ان کا یہ دوہرا رویہ یا دوہرا معیار نہ صرف قابلِ تحسین ہے بلکہ ان کے ہمہ جہت شاعر ہونے کی دلیل بھی ہے۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ شخصیت کے اعتبار سے ہمہ

صفت موصوف کہلائے جانے کا مکمل استحقاق رکھتے ہیں۔ امیدِ واثق ہے کہ فردائی ادوار کے محققین و ناقدین اور قارئین کی آراء بھی ہمارے موقف کی بھرپور تائید کریں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آگے ایک گیت محولہ موضوع کی نسبت سے ہے۔

آ جا مِرے پردیسی
آ جا مِرے پردیسی
ہر چیز بناں تیرے
آ دیکھ سجن میرے
غمگین ہے مجھ جیسی
آ جا مِرے پردیسی
دل پوچھتا ہے مجھ سے
کیوں دور ہے تُو مجھ سے
اب چھوڑو ستم ساجن
ہو جائیں بہم ساجن
اپنوں سے جفا کیسی
آ جا مِرے پردیسی
ایسا نہ ہو ہم سوچیں
شاید کہ ترے دل میں
چاہت نہیں اب ویسی
آ جا مِرے پردیسی
آ جا مِرے پردیسی

(ص:111-112)

اس گیت کی زبان روزمرہ اور سہلِ ممتنع کے قریب تر ہے۔ ہجر کا بیان اور شوقِ وصال اس میں نمایاں ہے۔ ساتھ ہی بالواسطہ طور پر ترغیبِ خلوص و مروت اور تاکیدِ مہر و وفا پائی جاتی ہے۔ محبوب سے وجہِ دوری دریافت کی گئی ہے اور اس گمان کا اظہار بھی ہے کہ محبوب میں اب پہلی سی محبت باقی نہیں رہی۔ یہ گیت سادہ اور آسان زبان کے باعث قبولِ عام کے وسیع تر امکانات رکھتا ہے۔ ہر ذہنی سطح کے قارئین اس سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ چونکہ اس میں سادہ ذہن رکھنے والوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ عام طور پر جیسے فوک لٹریچر یا لوک ادب ہوتا ہے، اس گیت کا بھی یہی انداز ہے۔ چنانچہ ہم اسے عوامی نوعیت کا کلام قرار دے سکتے ہیں۔ یہ گیت ہر طرح کے تکلفات و تصنعات سے ماورا و مبرا ہے۔ اس میں آجا کی تکرار شدتِ اشتیاق کو ظاہر کرتی ہے۔ وطن سے دور محبوب کے لیے پردیسی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے باعث گیت کی اپنائیت اور جاذبیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ طرزِ اظہار عاجزانہ اور منکسرانہ نوعیت کا ہے جو محبوبِ مغرور کے شایانِ شان ہے۔

اس کے بعد ایک اور گیت رونما ہوتا ہے جو موضوع سے مناسبت کا حامل ہے۔

چاہتیں دل میں لیتی ہیں انگڑائیاں
جب بھی میرے خیالوں میں آتے ہو تم

---

میں یہ سو بار کہنے کو تیار ہوں
میں تمھاری محبت میں سرشار ہوں
پیار اپنا مگر تم چھپاتے ہو تم
دستکیں دے کے جھونکوں کی صورت کبھی
بن کے شبنم کی پُرکیف نکہت کبھی

رات بھر آ کے مجھ کو جگاتے ہو تم
دکھ تمھارا مجھے تو گوارا نہیں
لیکن اتنا بتاؤ مِرے نازنیں
دور رہ کے مجھے کیوں ستاتے ہو تم
مژدۂ وصلِ گل لے کے آیا کرو
میرے غمگین دل کو لبھایا کرو
پھول کھلتے ہیں جب مسکراتے ہو تم
سامنے یونہی نظروں کے بیٹھے رہو
بھول کر بھی نہ اب نام جانے کا لو
جان جاتی ہے جس وقت جاتے ہو تم

(ص:113-114)

گیت میں براہِ راست محبوب سے تخاطب ہے اور بڑی صاف گوئی سے اظہارِ شوق کیا گیا ہے کہ جب بھی تم خیالوں میں آتے ہو، تو چاہتیں من میں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے، چاہے سو بار کہنا پڑے کہ تمہاری محبت میں سرشار رہوں، تمہارے ہجر میں بے قرار رہوں، تمہارا حال یہ ہے کہ تم اظہارِ محبت سے قاصر ہو۔ آخر کیا امر مانع ہے؟ یوں لگتا ہے کہ ہوا کے جھونکوں کی طرح دستکیں دے کر صبا کے روپ میں رقصاں ہو کر مجھے پیہم جگایا کرتے ہو کیونکہ رات کی رانی کی خوشبو کی طرح تم مجھے اپنی چاہت میں مستغرق رکھتے ہو، میرا حال یہ ہے کہ تمہاری کوئی تکلیف مجھے گوارا نہیں۔ مگر یہ بتاؤ کہ مجھ سے دور رہ کر کیوں ستاتے ہو؟ میری گزارش یہ ہے کہ ہمیشہ نویدِ وصال دیا کرو۔ میرے بے تاب دل کو بہلایا کرو۔ مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ اگر تم نگاہوں کے سامنے براجمان رہو اور ہنستے مسکراتے رہو کیونکہ جب ایسا ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے پھول کھل رہے ہوں، البتہ

یہ گزارش ضرور ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ نگاہوں کے سامنے رہو اور جانے کا نام بھی نہ لو، یہ گیت بحر متدارک مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہیں۔

اس گیت کے بعد ایک اور گیت اپنی بہار دکھا رہا ہے۔

تنہائی ہی تنہائی ہے
ساجن ہے نہ کوئی سہیلی
اجڑا اجڑا سا ہے گلشن
سونا سونا سا ہے آنگن
لگتی ہے ویران حویلی
پاس مِرے دل دار نہیں ہے
کوئی بھی غمخوار نہیں ہے
سلگا کرتی ہوں میں اکیلی
نندیا ساری رین نہ آئے
دن بھر مجھ کو چین نہ آئے
کیسا کھیل تھا جو میں کھیلی
کتنے دکھ ہیں کتنے غم ہیں
بچنے کی امیدیں کم ہیں
ناگن بن گئی رات البیلی
باغِ وفا پامال ہوا ہے
غم سے یہ میرا حال ہوا ہے
جیسے مرجھائے کوئی چنبیلی

اُس سے حال پیار کا پوچھوں
لے کر نام خدا کا پوچھوں
جو بھی آئے نئی نویلی
کون ہے جو میرا دکھ جانے
کون ہے جو مجھ کو پہچانے
میں اَن بوجھی ایک پہیلی

(ص:115-116)

گیت کا آغاز تنہائی کی دہائی سے ہوتا ہے۔کوئی ساجن کوئی سہیلی کوئی دوست نہیں، جیسے ویران باغ ہو، گھر کا آنگن سونا پڑا ہے اور حویلی سنسان سی ہے۔کوئی غمخوار، کوئی دلبر و دلدار نہیں، بالکل اکیلی رہ گئی ہوں، دراصل گیت کی زبان میں عورت عاشق کا کردار ادا کرتی ہے یا عاشق مونث کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔کیونکہ یہی گیت کا مزاج ہے اور اس کی پاسداری لازم ہے۔

ساری رات نیند نہیں آتی۔دل بے سکون رہتا ہے۔میں محبت کا کھیل کھیل کر مشکل میں پڑ گئی ہوں۔یوں لگتا ہے کہ دکھوں اور غموں کے محاصرے میں ہوں۔گلوخلاصی کی امید بہت کم ہے۔وہ البیلی رات جو کبھی پیامِ سرور دیتی تھی، اب ناگن کی طرح ڈستی رہتی ہے۔وفا کا باغ اجڑ گیا ہے۔غموں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور میری ذات مرجھائی ہوئی چنبیلی کی طرح ہو چکی ہے۔ہر نئی نویلی آنے والی سے خدا کا واسطہ دے کر محبوب کا حال پوچھوں، میرا دکھ بانٹنے والا اور مجھے پہچاننے والا کوئی نہیں ہے، میں ایک چیستاں ہو کر رہ گئی ہوں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ گیت خود میں ایسی صنائع و بدائع لیے ہوئے ہے، تشبیہات و استعارات کا نظام بھی کارفرما ہے اور گیت کے فکری تقاضے بھی پورے کیے گئے ہیں، نیز دردِ دل بھی بانٹا گیا ہے جس میں کتھارسز کا بھرپور انداز پایا جاتا ہے۔اسلوبیاتی حوالے سے

ہندی ادب کی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں۔اس سے آگے ایک اور نظم بعنوان ''سالگرہ مبارک'' جلوہ گر ہے۔

اے جانِ جہاں ، سالگرہ تجھ کو مبارک
اے رشکِ بتاں ، سالگرہ تجھ کو مبارک
یہ حسن ، یہ رعنائی ، یہ جوبن رہے قائم
یہ پیار کی پینگوں پہ یہی جھولا رہے دائم
اے حورِ جناں ، سالگرہ تجھ کو مبارک
تو گلشنِ دنیا میں بہاروں کی خبر ہو
ہستی تِری تسکینِ دل و خلدِ نظر ہو
اے حسنِ جواں ، سالگرہ تجھ کو مبارک
دکھ تجھ سے رہیں دور ، کرے بخت غلامی
دل جیتا کرے یونہی ، تِری شیریں کلامی
اے راحتِ جاں ، سالگرہ تجھ کو مبارک
خوشیاں تِری شیدائی ہوں ، غم پاس نہ آئیں
ہے میری دعا دور رہیں تجھ سے بلائیں
اللہ کی اماں ، سالگرہ تجھ کو مبارک

(ص:117)

سالگرہ منانا عہدِ جدید کے تقاضوں میں سے ایک ہے۔چنانچہ شاعر بھی اپنے محبوب کو اس کے جنم دن پر مبارک باد پیش کر رہا ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔محبوب کو جانِ جہاں اور رشکِ بتاں کے القابات سے نوازا گیا ہے اور جنم دن کی مبارک باد پیش کی گئی ہے اور دعا کی گئی ہے کہ تمہاری یہ رعنائی اور جوانی ہمیشہ سلامت رہے۔دعا ہے کہ تجھے

ہمیشہ محبت کی پینگیں میسر رہیں اور ان پر ہمیشہ جھولا کرے۔ تو میرے لیے جنت کی حور ہے۔ تو میری نویدِ بہار ہے۔ دل کی راحت اور نگاہ کی جنت ہے۔ تجھے قدرت سے حسین جوانی ودیعت ہے۔ تیری یہ سالگرہ مبارک ہو اور ہر آنے والا جنم دن تجھے پیامِ شباب دے۔ تجھ سے دکھ پرے اور نصیب تیری غلامی کرے۔ تو اپنی خوش کلامی سے دلوں کو مسخر کرتا رہے۔ تو راحتِ جاں ہے۔ یوں ہی خوشیاں تیری شیدائی رہیں اور غم نزدیک نہ پھٹکنے پائیں۔ یہ دعا ہے کہ ہر بلا تجھ سے دور رہے اور تجھے اللہ رب العزت اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ واضح رہے کہ گیت کی ہیئت شاعر کو ایسی پسند ہے کہ اس نے اپنی کئی نظمیات بھی گیت کی ہیئت میں رقم کی ہیں۔ نظم ہذا بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن ہیں۔

بعدازاں تیرہ اشعار پر مشتمل ایک غزل کے ساتھ اشعار حسنِ آرزو کے حامل ہیں۔

یہ حسنِ بے مثال ، یہ عالم شباب کا
جیسے بہار میں کھِلے غنچہ گلاب کا
چہرے پہ ایسا نور کہ ٹکتی نہیں نظر
ہے تاکنا محال جیسے آفتاب کا
آنکھوں سے مے برستی ہے ، عارض ہیں پھول سے
ہونٹوں کا سرخ سرخ رنگ لالِ ناب کا
آواز میں وہ نرمی اور لہجے میں وہ مٹھاس
مطرب نے تار چھیڑا ہو جیسے رباب کا
کل رات چاند نکلا جب بادل کی اوٹ سے
یاد آ گیا ترا الٹ دینا نقاب کا
اے دوست کچھ تو کم ہو یہ عصیاں کا بوجھ بھی

موقع نہ جانے دیجئے کوئی ثواب کا
کچھ یوں گزر رہے ہیں اب روز و شبِ حیات
فاتحؔ گماں گزرتا ہے عالم ہے خواب کا

(ص:121-122)

شعراول میں محبوب کی خوبصورتی اور شباب کو گلاب کے غنچے سے تشبیہہ دی گئی ہے جو موسمِ بہار میں کھل اٹھتا ہے اور حسن و رعنائی سے بھر پور ہوتا ہے۔ شاعر کے ہاں بہاریہ شعری امکانات بہاریہ شاعری سے بھی حسین تر اور وسیع تر ہیں جو بہاریہ شاعری کے احیا کی ایک شعوری کوشش محسوس ہوتی ہے۔ شعر ثانی میں کہا گیا ہے کہ رخِ جاناں ایسا ضو پاش ہے کہ اسے نظر بھر کر دیکھنا دشوار لگتا ہے جیسے سورج کی طرف دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں جمالیاتی اقدار اور حسنِ فطرت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ جمالِ یار کے ساتھ ساتھ اس کے جلال کا ایک پہلو بھی مترشح ہوتا ہے۔ شعرِ ثالث میں کہا گیا ہے کہ دیدارِ یار کر کے ایسا لگتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے مے برس رہی ہے اور اس کے ہونٹوں کی سرخ رنگت لال ناب کی یاد دلاتی ہے۔ شعر ہذا کا استعاراتی نظام بے حد دلکش ہے۔ مزید برآں اس میں خمریاتی حوالہ بھی پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے لکھنوی رومانویت کی روایت بھی تازہ ہوتی نظر آتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ شاعر کلاسیکی شعری روایت سے معقول شغف رکھتا ہے۔ شعر رابع میں کہا گیا ہے کہ محبوب کا لب و لہجہ ایسا نرم و گداز ہے اور تکلم میں ایسی مٹھاس ہے کہ یوں لگتا ہے کہ کسی موسیقار نے رباب کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ یہ شعر خوب صورت تشبیہات کا مرقع ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر ہذا میں تلازمات طرب کا استخدام پایا جاتا ہے۔ شعر خامس میں منظر نگاری کا کمال ہے کہ ہم نے کل شب جب چاند کو بادل سے باہر نکلتے دیکھا تو ہمیں ایک دم محبوب کا نقاب الٹا یاد آ گیا۔ یہ بھی ایک خوبصورت تمثیلی انداز ہے۔ بقول راقم:

قیامتوں کی قطار دیکھی
جو مہ وشوں کے نقاب اُترے

مزید برآں پتہ چلتا ہے کہ شاعر کا جمالیاتی وجدان عروج کو پہنچا ہوا ہے۔شعر سادس پند ونصیحت کا لطیف رنگ رکھتا ہے کہ ہمارے سر پر گناہوں کا اچھا خاصا بوجھ پڑا ہوا ہے۔ اس لیے ہمیں ہر وقت عاقبت سدھارنے کی فکر کرنی چاہیے اور نیکی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے تا کہ معصیت میں کمی واقع ہو۔گویا شعر ہذا میں روحانیت کا بھرپور آدرش پایا جاتا ہے۔شعر سابع میں جو غزل کا مقطع بھی ہے،اس میں کہا گیا ہے کہ زندگی کے روز وشب آج کل پورے گزر رہے ہیں، جیسے ہم عالم خواب سے گزر رہے ہوں۔ خواب خوبصورت بھی ہوسکتا ہے اور ناپسندیدہ بھی لیکن انسان کے اپنے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔

بعد ازاں ایک بھرپور نظم ''نویدِ جاں فزا'' سے معنون رونما ہوتی ہے جو مثنوی کے انداز میں مرقوم ہے جو یہ ایک نظم کی کلاسیکی ہیئت ہے۔

دوستو ، یہ نو ستاروں کی درخشاں کہکشاں
در حقیقت ہے ہدایت کا ، ترقی کا نشاں
سبز رنگ اس کے پھریرے کا پیامِ امن ہے
ہونے والا ہے فساد و ظلم کا اب قصہ طے
ہے دلیل اس بات کی ''ہل'' کا نشانِ انتخاب
رونما ہونے کو ہے اک روح پرور انقلاب
یعنی استیصال ، ظلم و جبر ہو جانے کو ہے
اک حسیں پودا زمیں پر پھر نمو پانے کو ہے
ہیں علاجِ ہر مرض جس کے مقدس برگ و بار

جس کے سائے میں ملے گا بے قراروں کو قرار
جس سے پائے گا زمانہ خیر و برکت کے ثمر
زہرِ شر کا دور ہو جائے گا ہر دل سے اثر
مرحبا ، وہ عدل و انصاف و اخوت کا سماں
صورتِ فردوس بن جائے گا جس میں یہ جہاں

(ص:123)

اس نظم کا سیاسی پس منظر یہ ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے وقت جب ملک کے مغربی حصے پر ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے مقابلے میں اسلامی نظریات کی حامل نو جماعتوں نے آئی جے آئی یعنی اسلامی جمہوری اتحاد کے نام سے ایک بڑی جماعت تشکیل دی جس کے جھنڈے پر نو ستارے بنے ہوئے تھے، ابوالبیان ظہور احمد فاتح جو ہمیشہ دائیں بازو کے طرفدار رہے ہیں۔ اپنی قلمی خدمت سے اس جماعت کی حمایت یوں کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ اے دوستو! یہ پرچم جو نو ستاروں کی چمکتی دمکتی کہکشاں ہے، دراصل نیکی و ترقی کا پرچم ہے، اس کا سبز رنگ امن کی علامت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ظلم و جبر کا قصہ تمام ہو جائے گا۔ اس جماعت نے اپنے لیے بطورِ خاص انتخابی نشان ہل کو اختیار کیا ہے، اس بات کی علامت ہے کہ ایک شاندار سبز انقلاب آنے والا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ خدا کی دھرتی میں ایک حسیں پودا نشوونما پانے والا ہے جس کے پاکیزہ پتے اور پھل ہر عارضے کا علاج ثابت ہوں گے۔ بے قرار لوگ اس کے سائے میں استراحت پائیں گے اور اہلِ دنیا کو خیر و برکت کے ثمرات حاصل ہوں گے۔ شر کے زہر کا اثر ہر دل سے دور ہو جائے گا۔ عدل و انصاف کا جو منظر ہمارے ذہن میں آ رہا ہے، ہم اسے خوش آمدید کہتے ہیں جس کی برکت سے دنیا جنت کا نمونہ بن جائے گی۔ عمومی طور پر عوام عموماً اور اہلِ قلم خصوصاً ہر اچھی جماعت سے اچھی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ پھر دل و جان سے اس کا ساتھ بھی دیتے

ہیں۔نظم ہذا بحر رمل مثمن مقصور/ محذوف میں کہی گئی ہے۔جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ فاعلان ہیں۔

بعدازاں ایک نظم جس کا عنوان ''میزبانی'' مرقوم ہے جو نظمِ معریٰ کی ہیئت میں ہے۔

پاس تیرے اگر اور کچھ بھی نہیں
ہے بہت اک نگاہِ کرم ہی سہی
تیرے ہونٹوں پہ شیریں تکلم سہی
خندۂ دیدۂ مہرباں ہی سہی
تیرے لب پر شعاعِ تبسم سہی
یہ ضیافت بھی کچھ کم نہیں دلنشیں

(ص:138)

دراصل یہ ایک تہذیب آموز نظم ہے،اچھی انسانی اقدار کی آموزش کی گئی ہے۔اے مخاطب تیرے پاس اگر پیش کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔کسی کو نگاہِ مہربان سے دیکھ لینا بھی دوسروں کے لیے خوش دلی کا باعث بنتا ہے۔یہ ساری خوبصورت ادائیں بھی کسی میزبانی سے کم تر نہیں۔اس انداز سے ملنے والوں کی تواضع کی جاسکتی ہے۔حقیقت میں حالیہ ادب میں ان امور کی شدید ضرورت ہے۔یہ مکارمِ اخلاق سکھانے کے لیے تیر بہدف ثابت ہوں۔یہ نظم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے نظریۂ ادب برائے زندگی کی سچی ترجمان ہے کیونکہ اس میں ایک معقول افادی پہلو پایا جاتا ہے۔

پیش کیے گئے استشہادات کی روشنی میں یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن میں حسنِ آرزو کے جو مقامات پائے جاتے ہیں۔وہ سماج کے لیے کسی خوانِ یغمہ سے کم نہیں۔ان میں مکارمِ اخلاق کا آدرش بھی ہے۔عمدہ تہذیب آموزی بھی ہے۔ادب برائے ادب کی نمائندگی بھی ہے۔محبت کی پذیرائی بھی ہے اور حسن کی قدردانی

بھی معاملاتِ حسن و عشق کا عمدہ استخدام بھی ہے۔ مہر و وفا کی ترغیب و تلقین بھی ہے۔ ہم یہاں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا کلام آفاقی نوعیت کا ہے اور اس میں ایک خوبصورت مثالی انداز پایا جاتا ہے۔ جس سے نظامِ تشبیہات و استعارات کے ذریعے خوبصورت بنایا گیا ہے۔

علاوہ ازیں معروضیت و معقولیت اور منطقیت کے شاندار دروس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز داخلی و خارجی دونوں پہلو پورے توازن کے ساتھ جزوِ بیان ہیں۔ ان کے ہاں اسلوبیاتی اور لسانی خوبیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ قاری ان کی فکری و فنی وسعت میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے ہاں پایا جانے والا موضوعاتی تنوع انفرادیت کی معراج ہے۔ حالانکہ ان کے ہاں حزنیہ شاعری کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن حسنِ آرزو سے مملو طربیہ اور رجائی انداز میں شعر کے افادی آفاق منور کر دیے ہیں جس کی بدولت شاعری کی اہمیت میں بھرپور اضافہ ہوا ہے۔ ان کے مجموعہء کلام ''صبحِ بہاراں'' مطبوعہ 2022ء کے مطالعہ سے قاری حزن و یاس کا شکار نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے پہلو میں ایک عزمِ جواں محسوس کرتا ہے جس کے باعث اسے زندگی خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی امیدیں اور امنگیں پرشباب ہو جاتی ہیں۔ عدم مقصدیت اور لایعنیت معدوم ہو جاتی ہے۔

نیز زندگی کی مقصدیت پورے طور پر روشن ہو جاتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس عہدِ قنوطیت میں ان کی شاعری کسی ٹانک سے کم نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عہدِ رواں اور ایامِ فردا میں نہ صرف ان کے کلام کو پڑھا اور سراہا جاتا رہے گا۔ بلکہ اس کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرنے کے پہلو بہ پہلو بھرپور انداز میں سراہا بھی جائے گا۔

باب پنجم

# اختصاصی مطالعے کا اجمالی جائزہ

ابو البیان ظہور احمد فاتح نے آغازِ کلام اس وقت کیا جب وہ 1967ء میں جماعت ہفتم کے طالب علم تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے حمد و نعت لکھی ور دو سال تک تسلسل سے نظمیں رقم کرتے رہے۔ جب جماعت نہم کے طالب علم تھے۔ اس وقت انہوں نے غزل لکھنا آغاز کیا لیکن انہیں غزل اس قدر پسند ہے۔ انہوں نے غزلوں کے انبار لگا دیے جب ہم نے کلامِ فاتح کا جائزہ لیا تو اس میں غزل کا عنصر غالب نظر آیا۔ چنانچہ ہم نے اپنی سب سے پہلی محققانہ و ناقدانہ تصنیف ان کے حوالے سے ''ابو البیان ظہور احمد فاتح کا کیفِ غزل''، مطبوعہ 2013ء لکھی جس کے اہم عنوانات حسبِ ذیل تھے۔

1۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا سوانحی وفنی تعارف

2۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح جمالیاتی احساسات کا شاعر

3۔ پروفیسر ابوالبیان ظہور احمد فاتح شاعرِ عرفان و آگہی

4۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح شاعرِ رجائیت

5۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح شاعرِ حزن و ملال

6۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح شاعرِ رومان

7۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح ایک انسان دوست شاعر

8۔ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کی شاعری کا اسلوبیاتی جائزہ

9۔کلامِ فاتح اور داخلی کیفیات

10۔ابوالبیان ظہوراحمد فاتح اور عصری رویے

11۔ابوالبیان ظہوراحمد فاتح اپنی طربیہ شاعری کے تناظر میں

12۔ابوالبیان ظہوراحمد فاتح سرخیلِ تعلیات

13۔ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کی فنی دقیقہ سنجیاں

14۔ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کثیرالجہات شاعر (ص:5)

ہم نے متذکرہ کتاب کی تکمیل کے بعد یہ شدت سے محسوس کیا کہ ہمیں صرف غزل تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے لہٰذا لگے ہاتھوں نظم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ بھی ہوجانا چاہیے۔ لہٰذا ہم نے ''ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کا منشورِ نظم'' کے نام سے 2016ء میں ایک جامع کتاب رقم کی جس کے مشمولات میں درج ذیل موضوعات شامل تھے۔

ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کی حمد نگاری

ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کی نعت نگاری

ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کی شاعری اور اسلامی خدوخال

ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کے ملی احساسات

ابوالبیان ظہوراحمد فاتح اور ان کی قومی شاعری

ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کے ہاں نقدِ دانش وحکمت

ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کے پیرایۂ شعر میں عمرانی ادراکات

ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کے سخن میں نفسیاتی امکانات

ابوالبیان ظہوراحمد فاتح کے فلسفیانہ تصورات

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن میں رومانی عناصر

ابوالبیان ظہور احمد فاتح اور آشوبِ عصر

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا طلسماتی اندازِ فکر وفن

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں نظامِ ترکیبات

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے تشبیہاتی آفاق

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا آئینۂ استعارات

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی شعری تمثیلات

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا وسیع تر لسانی استخدام

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم اور ہیئتی تجربات

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم نگاری کا اجمالی جائزہ

بعدازاں ہم نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ نظم اور غزل کو ساتھ ساتھ لے کر چلا جائے چنانچہ جون 2022ء میں ہم نے ''ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا آئینۂ فکر وفن'' کے نام سے ایک موقر کاوش طبع کرائی جس کی تبویب حسبِ ذیل ہے۔

1۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے آئینۂ فکر وفن کا اجمالی جائزہ

2۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا نظمیاتی کینوس

3۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن میں استفہامیہ اشارات

4۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کلام اور مشکل ردیفوں کا بیان

5۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی قطعات نگاری

6۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی ماہیا نگاری

7۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی غزل کے موضوعاتی تنوعات

اس کتاب کی بدولت شاعر موصوف کے بہت سے فکری وفنی پہلو نمایاں ہو گئے لیکن جوں جوں ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ ہم نے بھی اپنا تحقیقی سلسلہ جاری وساری رکھا۔ اس سلسلے کی ایک اور کاوش ''ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے تخلیقی خدوخال'' مطبوعہ اگست 2022ء ہے جس میں ہم نے کچھ مزید پیش رفت کی ہے۔ کتاب ہذا کے مندرجات کی فہرست کچھ یوں ہے۔

1۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی شاعری میں ردیفوں کا فکری مزاج

2۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن میں مشکل قوافی کا استخدام

3۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح دائیں باز و کا شاعر

4۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی غزل نگاری

بعد ازاں قدرے دشوار مگر اہم تر ادبی مقتضیات سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے ہم نے ایک اور تحقیقی وتنقیدی تصنیف بنام ''ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی ترجیحاتِ فکر وفن'' مطبوعہ اگست 2022ء پیش کی۔ اس کتاب کے موضوعات درج ذیل ہیں۔

اب اول: ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا نظریہء ادب برائے ادب

باب دوم: ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا نظریہء ادب برائے زندگی

باب سوم: ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے اخلاقی آدرش

باب چہارم: ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی ترجیحاتِ فکر وفن کا اجمالی جائزہ

واضح رہے کہ یہ کتاب جو آپ کے خوبصورت ہاتھوں میں ہے اور یہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح سے متعلقہ چھٹی کڑی ہے۔ جس کا آپ بخوبی و بصراحت مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اگر شاعر موصوف بسلسلہء تخلیق روبہ تسلسل رہا تو ہمارا خامہء تحقیق وتنقید بھی متحرک رہے گا۔ چنانچہ ہماری اگلی کتاب جو زیرِ منصوبہ ہے، اس کا نام ''ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا شعری

وجدان'' ہوگا جس میں ان کے خوبصورت اشعار کے تناظر میں تحقیق وتنقید قارئین کی نظر گزاری جائے گی۔ہم نے کتابوں کے اسماءاورعنوانات وموضوعات کے حوالے سے اس قدرعرق ریزی کی ہے،اس کا اندازہ تفصیل سے آپ کوبخوبی ہوگا۔ہمارا دعویٰ ہے کہ اصحا ب تحقیق وتنقید کواپنی مطالعاتی زندگی میں اس نوعیت کے موضوعات شاذونادرہی کہیں نظر آئے ہوں گے۔

عام طورپر ہم نے قارئین کی سہولت کے لیے مناسب اجمالی جائزے بھی رقم کیے ہیں لیکن یہ روش مستقل طور پر اختیارنہیں کی گئی۔کہیں ان سے گریز بھی کیا گیا ہے تاکہ قارئین یکسانیت کا شکارنہ ہوں۔اس طرح ہم اپنا سلسلہءتنوعات یوں بھی برقراررکھا ہے کہ کہیں ہم نے مفصل تجزیے رقم کیے ہیں۔کہیں ایجاز واختصار سے کام لیااورکہیں استشہادات بلاتبصرہ استخدام استشہادات واستخراجات میں بھی انفرادیت سے کام لیا ہے۔کہیں کہیں ہم ایک دو اشعاربطوراستشہادرقم کیے ہیں۔کہیں نصف کے قریب غزل پیش کردی ہے کہیں پوری پوری غزل نقل کردی ہے،اس طرح کہیں مکمل نظم سے کام لیا ہےتوکہیں محض اقتباسات کو بروئے کارلائے ہیں۔

اپنے شذرات میں ہم نے عموماً کلاسیکی انداز اختیارکیا ہے۔یعنی اس میں پہلے افتتاحیہ یاتمہیدلکھی ہے،پھرنفسِ مضمون پرتوجہ دی ہےاورآخر میں استخراجی نتائج کا اندراج عمل میں لائے ہیں۔یوں ان عناصرثلاثہ کاایک لطیف مگرمنطقی تعلق برقراررکھا ہے۔یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہم نے فکری وفنی جائزے لیتے ہوئے بحروزن اورعروضی ارکان کے حوالے بھی بطورِخاص اہتمام کیا ہے چنانچہ ہم نےعروضی تلازمات کے حوالے سے تصریحات رقم کرکے قاری کے لیےتفہیم عروض سہل تربنانے کی سعیِ بلیغ کی ہے کیونکہ اکثراصحابِ تحقیق وتنقیداس معاملے میں پختہ کارنہیں ہوتے۔لہٰذاوہ اکثروبیشترمبحثِ عروض

سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب جو چار بسیط ابواب پر مشتمل ہے، اور ایک باب اجمالی جائزے کی نسبت سے ہے، اس میں بھی ہم نے منفرد قسم کے موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ گویا ہم رفتہ رفتہ ارتقا کے زینے طے کرتے ہوئے معراجِ اختصاص پر پہنچے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ بھی کچھ زلفِ یار کی طرح دراز ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اس میں کسی ایک مقام پر تھمنے کے امکانات بہت کم نظر آتے ہیں۔ تاہم ہماری یہ کوشش رہے گی کہ ہم نت نئے موضوعات کی بازیافت میں مصروف و منہمک رہیں۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ہمارا طرزِ تنقید کلی نوعیت کا ہوگا۔ لہٰذا ہمارے تناظرات ہمہ گیر نوعیت کے ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہماری یہ شعوری کوشش رہے گی کہ ہم تنقید کے جملہ شعبے بروئے کار لائیں۔

کتاب ہذا کا باب اول جو ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا سخن مسئلہ جبر و قدر کے تناظر میں ہے، یہ موضوع خاصا اچھوتا سا ہے۔ عام طور پر اس موضوع کو ایک مذہبی معاملہ سمجھتے ہوئے اس سے کنارہ کشی کی جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ادب کا دائرۂ کار بسیط و عریض ہے۔ حیات و کائنات کے تمام تر موضوعات اس میں سموئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اسے نظر انداز کر جانا ایک گونہ ناانصافی ہوگی۔ بہت سے لوگ اس حوالے سے ردو کد اور کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن ہم نے پوری بالغ نظری کے ساتھ مناسب تصریحات کو بروئے کار لاتے ہوئے قاری کی تشویشات کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ قارئین و محققین اور ناقدین اس معاملے میں بہتر رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ہم اس معاملے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

باب دوم میں ہم نے دینی تقاضے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تناسب میں کلامِ فاتح سے استشہادات رقم کیے ہیں۔ یارانِ جہاں اس موضوع کو بھی مذہب کے کھاتے میں ڈال کر گریزاں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ آموزشِ تہذیب کے سلسلے میں یہ ایک بے حد

اہم ذمہ داری ہے جو ایک سچے شاعر و ادیب پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے اسے بزعمِ خویش بہ حسن وخوبی نبھانے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے یہ بھی سعی کی ہے کہ اسے وسیع تر تناظر میں پیش کریں۔ تاکہ یہ صرف ایک مذہبی امر ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ ایک ہمہ گیر ذمہ داری ثابت ہو۔ اسے منطقی طور پر ادب برائے زندگی کے زمرے میں لایا گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وسیع تر افادی پہلو اس میں پائے جاتے ہیں جنہیں نظر انداز کر دینا یقیناً کسی ناانصافی سے کم نہیں۔ مثال کے طور پر اس میں متعدد پہلو پائے جاتے ہیں جیسے سماجی، اخلاقی، اصلاحی اور فلاحی و رفاہی پہلو شامل ہیں۔

باب سوم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی زمانہ شناسی کے پس منظر میں ہے۔ یہ موضوع بھی فی نفسہٖ خاصا نرالا واقع ہوا ہے۔ اس لیے کم ہی محققین و ناقدین اس موضوع کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ قارئین کے لیے یہ موضوع کیا افادی پہلو رکھتا ہے؟ کم ازکم یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ اس میں بالیدہ فکری اور وسعتِ نظر پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز زندگی بہتر طریقے سے گزارنے کے لیے ان کی رہنمائی بھی ہوتی ہے۔ مزید برآں جس شاعر میں یہ وصفِ خاص بدرجہ اولیٰ پایا جاتا ہے، اس کے فکری وفنی کینوس کی اہمیت وافادیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایسا سخن ور تاریخ کے صفحات میں امر ہو جاتا ہے۔ یہ وصفِ خاص ہی کلاسیکی اساتذۂ سخن کی وجہِ شہرت کی بنیاد بنا ہے۔ چنانچہ جو سخن ور اس معاملے میں پیچھے رہ گئے ہیں، بامِ اوجِ ادب میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکے، اور جادۂ منزل کی گرد ہو کر اپنے تخلیقی کام کی اہمیت کھو چکے ہیں۔

باب چہارم ''ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا تصورِ حسنِ آرزو'' سے معنون ہے۔ یہ بھی ایک منفرد موضوع ہے جو خود میں بہت سے افادی پہلو رکھتا ہے۔ اس عنوان کے تحت ہم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ شاعر موصوف کا کلام ایک دم المیہ نہیں بلکہ اس میں جگہ

جگہ طربیہ پہلو بھی حسنِ آرزو کے حوالے سے پائے اجتے ہیں۔ یہ قنوطیت سے مبرا ہے اور خاصا رجائی رنگ سموئے ہوئے ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے تحت فضائے شعر خوشگوار اور زعفران زار ہو جاتی ہے۔ عموماً زیادہ حزنیہ شاعری کی وجہ سے شعری ساکھ کو جو نقصان پہنچتا ہے، یہ موضوع ازالہ کرنے میں خاص مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ جو لوگ یاس و قنوطیت کی بہتات کے باعث شاعری سے منہ موڑنے لگتے ہیں، حسنِ آرزو کے دلکش مظاہر انہیں مجبورِ مراجعت کر دیتے ہیں۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس وصف کے بغیر لوگ کلام کو لائقِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ فاتح جی کا اپنا ہی ایک شعر ہے:

وہ شعر سماعت کا سزاوار نہیں ہے
جس شعر میں ذکرِ لب و رخسار نہیں ہے

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس موضوع نے شاعری کی مقبولیت و وسعت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

باب پنجم جو اجمالی جائزے پر مشتمل ہے، یوں سمجھیے کہ کتاب ہذا کا مکھن ہے جسے آپ حاصلِ مطالعہ کا نام دے سکتے ہیں۔ اجمالی جائیزے میں ہم نے اپنی مکمل حکمتِ عملی قارئین پر واضح کر دی ہے تاکہ وہ ہر نوع کے شکوک و ابہام سے مبرا و ماورا ہو کر تفہیمِ معاملات میں آسانی محسوس کرے۔ ہم نے اپنی اس تمام تر تصنیف میں خالص ادبی اسلوب اور بامحاورہ زبان و بیان کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ تمام تر بیانی لطافتوں، نفاستوں اور نزاکتوں کا خیال رکھا جن میں مقصدیت اور تفننِ طبع دونوں پہلو شامل ہیں۔

--- تمت بالخیر ---

# شبیر ناقدؔ کی گراں قدر تخلیقی تصانیف

## ۱۔شاعری کی مطبوعہ کتب:

| | |
|---|---|
| ۱-صلیبِ شعور (غزلیات ونظمیات) | ۲۰۰۷ء |
| ۲-من دی مسجد (سرائیکی شاعری) | ۲۰۱۰ء |
| ۳-آہنگِ خاطر (غزلیات ونظمیات، گیت، قطعات) | ۲۰۱۱ء |
| ۴-جادہ فکر (غزلیات ونظمیات) | ۲۰۱۴ء |
| ۵-صبحِ کاوش (غزلیات، نظمیات) | ۲۰۱۵ء |
| ۶۔دل سے دور نہیں ہوتم (غزلیات ونظمیات) | ۲۰۱۶ء |
| ۷۔کتابِ وفا (مجموعہ غزل) | ۲۰۱۶ء |
| ۸-گنجِ آگہی (مجموعہءغزل) | ۲۰۱۶ء |
| ۹۔روح دی روہی (سرائیکی شاعری) | ۲۰۱۶ء |
| ۱۰۔جہانِ عقل وجنوں (اردو شاعری) | ۲۰۱۷ء |
| ۱۱۔زادِ سخن (اردو شاعری) | ۲۰۱۷ء |
| ۱۲۔حسنِ خیال (اردو شاعری) | ۲۰۱۸ء |
| ۱۳۔رتجگوں کا سفر (اردو شاعری) | ۲۰۱۸ء |
| ۱۴۔طرزِ بیاں (اردو شاعری) | ۲۰۱۸ء |
| ۱۵۔عکاسِ احساس (اردو شاعری) | ۲۰۱۸ء |
| ۱۶۔نقدِ فکر ونظر (غزل ونظم) | ۲۰۱۹ء |
| ۱۷۔ریاضِ دانش (مجموعہءغزل) | ۲۰۱۹ء |
| ۱۸۔ضیافتِ اطفال (بچوں کیلئے شاعری) | ۲۰۱۹ء |
| ۱۹۔شہرِ سخن (مجموعہءکلام) | ۲۰۱۹ء |
| ۲۰۔نوائے شوق (مجموعہءکلام) | ۲۰۲۱ء |
| ۲۱۔سک داسیک (سرائیکی مجموعہءکلام) | ۲۰۲۲ء |
| ۲۲۔کلیاتِ شبیر ناقدؔ (اردو، جلد اول) | ۲۰۲۳ء |

۲۔گراں قدر تحقیقی وتنقیدی مطبوعہ کتب:

| | |
|---|---|
| ۱-ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیف غزل (شخصیت اور فن) | ۲۰۱۳ء |
| ۲-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ اول) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام | ۲۰۱۳ء |
| ۳-شاعراتِ ارضِ پاک حصہ دوم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام | ۲۰۱۳ء |
| ۴-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ سوم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام | ۲۰۱۳ء |
| ۵-نقدِ فن (تنقیدی مضامین) | ۲۰۱۴ء |
| ۶-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ چہارم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام | ۲۰۱۴ء |
| ۷-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ پنجم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام | ۲۰۱۵ء |
| ۸-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ ششم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام | ۲۰۱۵ء |
| ۹۔شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ ہفتم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام | ۲۰۱۶ء |
| ۱۰۔تلمیحاتِ فضا اعظمی (تنقید وتحقیق) | ۲۰۱۶ء |
| ۱۱-شاعراتِ ارضِ پاک جامع ایڈیشن (حصہ اول) | ۲۰۱۶ء |
| ۱۲۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منشورِ نظم (نظمیاتی تجزیہ) | ۲۰۱۶ء |
| ۱۳-میزان تنقید (تنقیدی مضامین) | ۲۰۱۷ء |
| ۱۴-تنقیدات (تنقیدی مضامین) | ۲۰۱۸ء |
| ۱۵۔سفرنامہ نگاری کے انتقادی امکانات (حصہ اول) | ۲۰۱۸ء |
| ۱۶۔شاعراتِ ارضِ پاک (جامع ایڈیشن) جلد دوم | ۲۰۱۸ء |
| ۱۷۔فضا اعظمی کی شاعری (تلمیحات کے آئینے میں) اضافہ شدہ ایڈیشن | ۲۰۱۹ء |
| ۱۸۔تناظرات (تحقیق وتنقید) | ۲۰۲۲ء |
| ۱۹۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا آئینۂ فکر وفن (تحقیق وتنقید) | ۲۰۲۲ء |
| ۲۰۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے تخلیقی خدوخال (تحقیق وتنقید) | ۲۰۲۲ء |
| ۲۱۔شاہدہ لطیف کا تخلیقی ارتقا (تحقیقی وتنقیدی تجزیاتی مطالعہ) | ۲۰۲۳ء |
| ۲۲۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی ترجیحاتِ فکر وفن (تحقیق وتنقید) | ۲۰۲۳ء |
| ۲۳۔ڈاکٹر شہناز مزمل کے تخلیقی آفاق واعماق | ۲۰۲۳ء |
| ۲۴۔ادبیاتِ ارضِ پاک (حصہ اول) تحقیق وتنقید | ۲۰۲۴ء |
| ۲۵۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن کا اختصاصی مطالعہ | ۲۰۲۴ء |